آپ کی لائبریری

مشرف عالم ذوقی

PDF By : Meer Zaheer Abass Rustmani

Cell NO : +92 307 2128068 - +92 308 3502081

مسلمان

ناول

مسلمان

ناول

مشرف عالم ذوقی

ناشر:

AALAMI MDEDIA PVT.LTD.

1/1,Kirti Apts., Mayur Vihar-1

Delhi -110091

Ph:9717474307

© تبسم فاطمہ

نام کتاب : مسلمان
مصنف : مشرف عالم ذوقی
ناشر :عالمی میڈیا پرائیویٹ لمیٹیڈ
تعداد : 1000
باردوم :2014
طابع :مونی پرنٹنگ پریس، دہلی
قیمت :

AALAMI MDEDIA PVT.LTD.
1/1,Kirti Apts., Mayur Vihar-1
Delhi -110091
Ph:9717474307

پیارے دوست

محمد حامد سراج

کے نام

Mir Zaheer abass Rustmani
03072128068

مسلمان

ناول

مشرف عالم ذوقی

فہرست

مسلمان ـــــ دہشت گرد یا.....؟ 9
مسلمان ـــــ کیوں؟ 17
کچھ 'مسلمان' کے بارے میں 20
ناول 27

مسلمان: دہشت گرد یا.....؟

مسلمان ہندی میں 1990ء میں شائع ہوا ـــــ اردو میں یہ ناول 24 سال بعد شائع ہو رہا ہے۔ان برسوں کے پیچھے کوئی مجبوری نہیں تھی۔ واقعات ہر بار کروٹ لیتے رہے اور ہر بار سوچتا تھا۔نہیں، ابھی نہیں..... ابھی فضا ٹھیک نہیں ہے۔ممکن ہے کوئی ایسا معجزہ ہو جائے کہ مسلمانوں کو دہشت گرد کہنا ہمیشہ کے لئے بند ہو جائے۔کئی بار خود کو سمجھاتا تھا.....تم، غلط ہو ذوقی۔ تمہیں اس ناول کا نام ''مسلمان'' نہیں رکھنا چاہئے تھا۔'مسلمان' ـــــ آخر کیا سوچ کر تم نے اس ناول کا نام 'مسلمان' رکھا۔یعنی وقت کے ساتھ یہ نام اب مذہب سے نہیں، مین اسٹریم یعنی 'مکھیہ دھارا' کے اسلامی Terrorism سے جوڑ دیا گیا ہے ـــــ ہے نا؟ دنیا کی یہ دوسری بڑی قوم عالمی توپ کے نشانہ پر ہے اور دہشت گرد قرار دی جا چکی ہے۔

24 برس پہلے بھی میں کچھ ایسے ہی احساس سے دوچار تھا۔

بلکہ ان 24 برسوں میں 'مسلمان' ہونے کا یہ احساس کچھ زیادہ ہی شدت اختیار کرتا چلا گیا۔حقیقت کچھ تھی۔بُش اور بلیئر کچھ اور ہی افسانہ لکھ رہے تھے۔افغانستان سے عراق، اور اُسامہ سے صدام تک امریکہ صرف ایک ہی کہانی دُہرا رہا تھا۔

Terrorist کون.....؟

ارے بھائی، مسلمان.....اور کون.....یعنی پہلی گولی اسلام پر چلاؤ۔مسلمان تو ہلاک ہو ہی جائے گا۔

صورت حال پہلے ہی بدل چکی تھی

لیکن ان چوبیس برسوں میں صورت حال اور بھیانک ہوئی ہے۔ مجھے لگتا ہے، ایک ہندوستانی اور وہ بھی مسلمان ہونے کے نام پر مجھے ان واقعات کا تجزیہ کرنے کا حق حاصل ہے۔ پچھلے دس برسوں میں دنیا کی اس سب سے بڑی، دوسری قوم نے کسی بھی ملک میں، کسی بھی سطح پر کچھ بھی کیا ہو، میڈیا نے ہر بار مسلمان اور اسلام کو کچھ ایسے خونی رنگوں میں پیش کیا ہے کہ پڑھتے اور دیکھتے (مختلف چینلس پر) ہوئے ہر بار ایک مسلمان ہونے کی حیثیت سے تکلیف کا سامنا کرنا پڑا ہے۔ تکلیف کا احساس تو ایک الگ بات ہے، ہندوستان کی اس پچیس کروڑ آبادی کو سامنے والے کی آنکھوں میں شک کی پرچھائیاں نظر آئی ہیں۔

''ارے، آپ مسلمان ہو؟''

''ہاں بھئی ہاں.....''

''تو.....مسلمان ایسے بھی ہوتے ہیں۔''

''یعنی مسلمانوں کو کیسا ہونا چاہئے؟''

''نہیں۔ میرا مطلب ہے.....''

میں سمجھاتا ہوں۔ میزائلیں، راکٹ لانچرس، اے کے-47 وغیرہ ہر وقت ہاتھوں میں رکھ کر گھومنا چاہئے ـــــ تاکہ دور سے ہی انہیں دیکھ کر زمین جوتتا ہوا کسان تک چیخ اٹھے۔ وہ جارہا ہے مسلمان.....(آتنک وادی).....ہے نا؟''

●●

اسلام: اسلام اور مسلمان:

امریکہ اور امریکی حکمراں آخر ایسا کیوں سوچتے ہیں کہ وہ غیر مفتوح بن چکے ہیں۔ یعنی ایسی طاقت، جس پر فتح نہیں پائی جاسکتی۔ ایسی طاقت، جسے وہ کسی کے بھی خلاف استعمال کرسکتے ہیں۔ شعلے اُگلتے ہوئے ورلڈ ٹریڈ سینٹر کی طرف اچانک اپنے چھوٹے سے کیمرے (مووی) کا رخ کرنے والے کے ہونٹوں سے ایک لفظ نکلا تھا.....شٹ..... جلتے اور دھوئیں اگلتے ٹاور کی تصویر اپنے اپنے ٹی وی اسکرین پر جس کسی نے دیکھی ہو، اس نے یہ لفظ ضرور سنا ہوگا۔ یہ لفظ امریکہ کی،

اب تک کی غیر مفتوح طاقت پر ایک ایسا غیر جانبدارانہ تبصرہ ہے، جس پر امریکہ کو غور ضرور کرنا چاہئے ـــــ پہلی بار امریکی عوام کو بھی اس بات کا احساس ہوا کہ وہ بھی دیگر ممالک کی طرح ہی عام انسان ہیں۔ جن پر حملے ہوسکتے ہیں۔ امریکہ، جس کی فرعونیت جاپان، کیوبا، ویتنام، نکاراگوا، صومالیہ، کوریا، عراق، فلسطین سے نکل کر افغانستان تک پھیل گئی تھی ـــــ ورلڈ ٹریڈ سینٹر پر حملے کے بعد اسی امریکہ کا جائزہ لیجئے تو اُسامہ اور ایتھریکس کے خوف نے اس کی اصلیت جگ ظاہر کردی ہے۔ اس کی طاقت کے پرخچے اُڑ چکے ہیں۔ اس کے بیانات کا بھانڈہ پھوٹ ہوچکا ہے۔ وہ امریکہ جو دوسروں کے گھروں میں سیندھ لگاتا پھرتا تھا اور دیگر ممالک میں ہونے والی ہر کارروائی کے بعد اس کا پہلا تبصرہ ہوتا تھا۔ مجھے پہلے سے ہی سب کچھ پتہ تھا۔ اس کی خفیہ ایجنسیوں کی پول بھی کھل چکی ہے۔ ادب کی نابل انعام یافتہ ارون دھتی رائے نے اپنے ایک مضمون میں لکھا تھا کہ 'آخر امریکہ کے فوجی اور معاشی مراکز یعنی ورلڈ ٹریڈ سینٹر اور پنٹاگن پر ہی حملے کیوں ہوئے۔ آزادی کی علامت اسٹیچو آف لبرٹی کو کیوں بخش دیا گیا۔ یعنی یہ غصّہ جمہوریت کے خلاف نہیں ہے بلکہ امریکی عوام کو سمجھ لینا چاہئے کہ ساری دنیا ان سے نفرت نہیں کرتی بلکہ امریکی حکومت کی پالیسیوں سے نفرت کرتی ہے۔

ایک ڈرا ہوا آدمی دوسرے ڈرے ہوئے آدمی سے مدد مانگتا ہے

یہ ثابت کرنے کی ضرورت نہیں ہے کہ امریکہ ڈر گیا ہے۔ اُسامہ سے ایتھریکس تک، امریکیوں کے اندر کا انسان امریکی جاگ رہا ہے۔ اسکرین پر مسکراتے ہوئے بُش کے چہرے کے پیچھے کا سناٹا، صاف دکھائی دے جاتا ہے۔ کہتے ہیں، ایک ڈرا ہوا آدمی دوسرے ڈرے ہوئے آدمی سے مدد مانگتا ہے۔ یعنی یقین کیجئے، اور سب کچھ کتنا مضحکہ خیز لگتا ہے کہ اس مہذب، ترقی یافتہ دنیا میں ایک آدمی 7000 انسانی جانوں کا انتقام لینے کے لئے کس طرح سامنے آتا ہے۔ بُش نے ہالی وڈ میں بننے والی وہ فلم ''مارسس ایٹک'' ضرور دیکھی ہوگی۔ عالمی ممالک اور منگل سیارہ کے درمیان امن اور بھائی چارہ پر گفتگو ہوتی ہے۔ امریکی پریسیڈنٹ، وہائٹ ہاؤس کے شاندار کمرے میں اپنے ٹی وی اسکرین پر فیملی کے ہمراہ یہ منظر دیکھ رہا ہے۔ منگل سے آنے والوں کا طیارہ رُکتا ہے۔ امریکی جنرل امن کی علامت کبوتر کو اڑاتے ہیں اور ادھر منگل سے آیا خوفناک انسان، اپنے چھوٹے سے اسلحے کا استعمال کرتا ہے اور امن کی علامت کبوتر، لہولہان ہوکر زمین پر گر پڑتا

ہے..... ہے، نا، کتنا مضحکہ خیز۔ امریکہ جو اپنی پیدائش سے ہی دہشت گردی کے بیج بوتا اور اس کا پھل کھاتا رہا ہے آج 7000 جانوں کے انتقام کے طور پر پتہ نہیں کتنی ارب جانوں کا دشمن بن چکا ہے۔ تفصیل بتانے کی ضرورت نہیں۔ صرف 50 برس کی دہشت گردی کا مطالعہ کریں تو ملٹری پاور امریکہ کا بھیک کھل جاتا ہے۔

- 1948ء سے اب تک اسرائیلی ریاستی دہشت گردی، فلسطینی عوام کے خلاف ایک لاکھ عام شہری ہلاک، امریکہ کے تعاون سے۔
- 1991ء سے اب تک عراق کا حشر دیکھ لیجئے۔ 5 لاکھ سے زائد جان بحق۔
- 1993ء سے اب تک صومالیہ میں ہزاروں ہلاک۔
- 1989ء پنامہ پر امریکی حملہ۔
- 1981ء سے 1989..... پس منظر میں لیبیا۔ کرنل قذافی کے قتل کی کوشش
- 1945 سے 1974ء تک ویتنامی عوام کی امریکہ کے ہاتھوں نسل کشی۔ 25 سے 35 لاکھ عوام ہلاک۔
- 1955ء سے 1973ء کمبوڈیائی عوام۔ دس سے بیس لاکھ ہلاک

دہشت کا خوف دکھا کر ہی امریکہ دنیا میں خطرہ نمبر ون بنا ہے..... پنٹاگن اور ورلڈ ٹریڈ سینٹر پر ہوئے حملے کے بعد سی۔ این۔ این سے ایک خوفزدہ لڑکی کا چہرہ سامنے آتا ہے جو روتی ہوئی کہتی ہے..... ''پہلی بار ایسا لگا کہ ہم بھی انسان ہیں۔ ہم پر بھی حملہ ہو سکتا ہے۔

یہ جنگ اسلام کے خلاف نہیں

ٹانی بلیئر اور بُش کو بار بار یہ صفائی دینے کی کوشش کیوں پڑ رہی ہے کہ یہ جنگ اسلام کے خلاف نہیں ہے۔ پاکستان کے جنرل پرویز مشرف اور ہندوستان کے باجپائی اور اڈوانی تک کو بار بار یہ کہنے کی ضرورت پیش کیوں ہو رہی ہے کہ جو کچھ ہو رہا ہے وہ آتنک واد کے خلاف ہے۔ (یو۔ پی۔ آئی کی حکومت آنے کے بعد اب بھاجپا مکمل طور پر، کُھل کر مسلمان دشمنی میں آگے آ چکی ہے۔)

آتنک واد کیسا.....؟

اسلامی.....

اسلام کے ماننے والے کون؟

مسلمان.....!

'کان ادھر سے پکڑو چاہے ادھر سے' کا محاورہ بدل چکا ہے۔ معاملہ یہ ہے کہ ہم کان، کو ناک کہتے ہیں تو آپ بھی ناک کہیں۔ یعنی جنگ اس بات کی ہے کہ آپ کان کو کان کیوں کہہ رہے ہیں۔ آپ ایک مسلمان (آتنک وادی) کو ختم کرنا چاہتے ہیں۔ ختم کر دیجئے۔ مگر آپ کی منشا اتنی نہیں ہے۔ تاجکستان، پاکستان اور ہندوستانی ساحلوں پر جنگی بیڑے بٹھانے کی کارروائی کے پیچھے انکل سام کا سازشی چہرہ صاف نظر آ رہا ہے۔ اُسامہ کی آڑ لے کر بُش نے امریکی تہذیب بنام اسلامی تہذیب کے جہاد کو صاف کر دیا ہے۔ بلیئر اور بُش کی نیتیں اب ظاہر ہونے لگی ہیں۔ 1991ء کے عراقی حملے کے بعد نئی تہذیب کا منظر نامہ لکھنے میں امریکہ کو کامیابی اس لئے بھی مل رہی ہے کہ وہ بلوں میں دبکے پڑے اسلامی ممالک کی کمزوریوں 'شراب، عورت اور امریکہ کا ساتھ' کے فارمولے پر عمل کر رہا ہے.....

ہائے میڈیا، وائے میڈیا

کتنی عجیب بات ہے۔ ایک شخص آپ کے گھر آتا ہے۔ آپ سے کہتا ہے۔ اپنے آپ کو گالی دیجئے۔ آپ کو اس کے عوض پیسے دیتا ہے۔ پھر کہتا ہے۔ آپ اپنی بہن کو، بیوی کو، بیٹیوں کو گالیاں دیجئے اور آپ اس کے حکم کی تعمیل میں شروع ہو جاتے ہیں۔ مائی ڈیئر ٹانی بلیئر اور انکل سام کے کارنامے دیکھئے تو شاید وہ تمام اسلامی ممالک کے ساتھ یہی رویہ اپنا رہے ہیں۔ اسلام گالیوں کا نشانہ بن رہا ہے۔ اخبارات مسلمانوں کو ذلیل کر رہے ہیں۔ افغانستان کے بہانے مسلمانوں کی داڑھیاں تک مذاق کا نشانہ بننے لگی ہیں۔ بات آہستہ آہستہ آگے بڑھ رہی ہے۔ میڈیا ذرا سا ہاتھ پاؤں نکال کر یہ دیکھنے کی کوشش کر رہا ہے کہ آپ کب تک خاموش رہتے ہو۔ یا آپ کے صبر کی انتہا کہاں تک ہے۔

''وہ آہستہ آہستہ آگے بڑھ رہے ہیں/
وہ ایک دن اچانک آپ پر حملہ کر دیں گے/
آپ کو پتہ بھی نہیں چلے گا/
اور آپ اتنے بے بس ہوں گے/

کہ تہذیب کے جنازہ کو کندھا بھی نہیں دے سکیں گے/''

تہذیب.....سوچنا پڑتا ہے۔ کہیں یہ سارا معاملہ اسلامی تہذیب کو ختم کرنے کے لئے تو نہیں کھیلا جا رہا اور کیسی عجیب بات ہے۔ ڈرامے میں، اسی تہذیب کے ملاؤں، صافہ باندھے ہوئے، داڑھیاں رکھے ہوئے، پنج وقتہ نمازی، اسلام کے ارکان کا سختی سے عمل کرنے والے مسلمانوں نے دل کھول کر اپنی شرکت کی، نہ صرف فیاضی دکھائی بلکہ اسلام کے خلاف کی جانے والی تقریروں کی تائید میں بھی انکل سام کی پیٹھ ٹھوکی ہے۔ واہ واہ شاباش.....انکل سام سعودی عرب جیسے ملکوں کا احوال جانتے ہیں۔ وہ جانتے ہیں کالے گھوڑے کے شکار کے لئے کالے گھوڑوں کو ہی آگے کرنا ہوگا۔ وہ یہی کر رہے ہیں اور تماشہ دیکھ رہے ہیں۔

تہذیبوں کی جنگ..... یہ فلسفہ پیش کیا تھا، 12-13 سال پہلے پنٹاگن کے صحافی، ٹینگٹن نے اور کہا تھا کہ عیسائیت اور اسلام کے درمیان تہذیبوں کو لے کر ایک بڑی جنگ ہونے والی ہے۔ یہ بھی لکھا تھا کہ اس جنگ میں اسلام کے خلاف ہندو دھرم کا استعمال ساتھی کے طور پر کیا جائے گا۔ ٹینگٹن، عالمی نقشہ پر صلیب کی فتح دیکھنے کے خواہشمند تھے۔ ان کے مطابق عیسائی تہذیب ہی، سچی تہذیب ہے اور اس تہذیب کو دنیا کے نقشہ پر لانے کی ذمہ داری امریکہ کی ہے۔ ٹینگٹن نے وہائٹ ہاؤس کے حکمراں کو 'کروسیڈر' کا رول ادا کرنے پر زور دیا.....تاکہ اسلام اور دوسری کمزور تہذیبوں کو ختم کیا جا سکے۔ ٹینگٹن نے اس موضوع پر ایک کتاب بھی لکھی۔ تہذیبوں کی جنگ اور ایک نیا عالمی منظر نامہ۔ تہذیبوں کی جنگ یعنی جہاد.....ٹینگٹن نے اس جنگ کو جہاد کا نام دیا۔

اگر امریکہ عیسائی تہذیب کو دنیا کی سب سے اچھی تہذیب کے طور پر پیش کر سکتا ہے،
تو اُسامہ، اسلام کو سب سے اچھی تہذیب کے طور پر کیوں نہیں پیش کر سکتا؟
'میرا کپڑا ان کے کپڑے سے زیادہ سفید' کہنے میں برائی ہی کیا ہے۔

جینے کے لئے، اس مہذب دنیا میں تین نہیں بلکہ چار چیزوں کی ضرورت پڑتی ہے.....
روٹی، کپڑا، مکان اور غیرت.....افسوس کا مقام ہے کہ امریکہ نے اس غیرت کا سودا کر لیا۔ جب ان تہذیبی جنگوں کی تاریخ لکھی جا رہی ہوگی تو مؤرخ یہ ضرور لکھے گا کہ اس انتہائی مہذب دنیا نے ڈرا اور خوف کی بنا پر امریکہ سے اپنی غیرت فروخت کرنے کا بہت ہی سستا سودا کیا تھا.....ساری دنیا پر دہشت اور خوف مسلّط کرنے والے نے اس صدی کا سب سے بڑا چٹکلہ جاری کیا تھا.....

''آؤ، جنگ جنگ کھیلتے ہیں۔''

پھر اس نے مسکرا کر کہا.....اس جنگ کو دہشت پسندی کے خلاف ایک ضروری عمل قرار دیتے ہیں۔

بادشاہ کے سپہ سالاروں کا کام صرف سننا ہے اور بادشاہ کی تائید میں گردن ہلانا ہے۔ اور یقین جانئے.....بس یہی ہو رہا ہے۔ بچپن میں ایک ڈرامہ پڑھا بھی تھا اور کھیلا بھی..... علاء داد خاں عرف ایک گدھا.....اندھیر نگری کے اس چوپٹ راجہ کے سب سے خطرناک چٹکلہ پر کسی کو بھی غصّہ نہیں آ رہا ہے ـــــ بلکہ سب کے سب ہنسے جا رہے ہیں۔ مشینی طرز پر سہمے ہوئے اور سر جھکائے ہوئے ـــــ

یہ افسوسناک صورت حال ہے ـــــ اور اس کی دھند میں اسلام کا چہرہ ہر لمحہ گم ہوتا یا دور ہوا نظر آ رہا ہے.....سامراجی عالم کاری کے تضادات صاف نظر آ رہے ہیں اور یقیناً، ہم میں سے کوئی بھی آوازِ احتجاج بلند نہیں کرے گا۔ اس لئے کہ جو آئین دوسرے ملکوں پر نافذ ہوتا ہے وہ امریکہ پر نافذ نہیں ہوتا..... پنٹاگن اور ورلڈ ٹریڈ سینٹر کے بہانے امریکہ کو اپنا کھیل، کھیلنے کا موقع مل گیا ہے.....اور ابھی تک جو ممالک امریکہ کے ساتھ نہیں آئے ہیں، وہ مسلسل انہیں للکارنے کی کوشش کر رہا ہے۔

''آؤ۔ جنگ جنگ کھیلتے ہیں''

اور آخر میں

15/اگست 1990 ـــــ آزادی کی 43 ویں سالگرہ کے موقع پر میں مسلمان کا آخری صفحہ لکھنے بیٹھا تھا۔ یعنی مسلمان مکمل کر چکا تھا۔ 92ء میں، یعنی تحریر کئے جانے کے دو سال بعد اندر پرستھ پبلشرز نے اسے ہندی میں شائع کیا۔

ان برسوں میں صورت حال کچھ زیادہ ہی بھیانک ہو چکی ہے۔ 24 سال پہلے تک اسلامی آتنک واد کی آوازیں اس قدر تیزی سے نہیں گونجی تھیں۔ ان 24 برسوں میں امریکہ کے سُر میں سُر ملاتے ہوئے پوری دنیا نے ایک ساتھ اسلامی دہشت گردی کے خلاف چلانا شروع کر دیا ـــــ

24 برس پہلے میرے خوف کا محور صرف ہندوستان تھا ـــــ

'میں نے ونئے کا قتل کر دیا ہے.....'

'ہماری مجبوری یہ ہے کہ ہم ایک ساتھ رہنا چاہتے ہیں۔
ایک آسمان، ایک چھت کے نیچے۔ مگر ہم دونوں میں سے
کسی کو نیند نہیں آ رہی ہے ـــــ ڈر لگتا ہے، ایک کی آنکھ
لگ گئی تو دوسرا چھرا بھونک دے گا ـــــ'

67 برسوں کا ـــــ ممکن ہے، یہ واقعہ کوئی سچ نہیں ہو۔ خدا نہ کرے۔ مگر 67 برسوں میں ہونے والے 'فساد موسم' کا یہ سچ ضرور رہا ہے ـــــ

●●

مسلمان لکھتے ہوئے میں نے ایک تجربہ اور کیا ـــــ جس طرح Visual Media کو سامنے رکھتے ہوئے اسکرپٹ لکھی جاتی ہے، میں نے جزیات کا سہارا نہیں لینے کا فیصلہ کیا تھا ـــــ یعنی ہر باب میں زبردست Readability ہو۔ یعنی Visual صاف ہو ـــــ فکر کے عناصر کم سے کم آئیں ـــــ جو بھی کہنا ہو، اسے Visual میں ہی کہا جائے۔

اس کے لئے میں نے ایک ایسی تھیم کا انتخاب کیا، جہاں محدود پیرائے میں اپنی بات کی وضاحت کر سکوں۔

نئے الفی کے ان 14 برسوں میں یہ دنیا کچھ اور 'مختلف' ہو گئی ہے۔ 'مسلمانوں اور 'اسلام' کو لے کر ـــــ میں نے مسلمان۔2 لکھنے کا فیصلہ کیا ہے۔ دیکھئے مسلمان کا یہ دوسرا حصہ میں کب تک مکمل کر پاتا ہوں۔

آپ کے جواب کا انتظار رہے گا۔

ـــــ مشرف عالم ذوقی

مسلمان ـــــ کیوں؟

ایم۔ قمر علیگ

مشرف عالم ذوقی نے گیارہ سال کی چھوٹی سی عمر سے ہی لکھنا شروع کر دیا تھا۔ یعنی اگر ان کی تخلیقی عمر کا اندازہ لگایا جائے تو یہ بیس سال سے بھی زائد ہو جاتی ہے۔ ذوقی کی کہانیاں پچھلے دس پندرہ برسوں سے اردو، ہندی کے تمام بڑے رسائل میں شائع ہوتی رہی ہیں ـــــ ذوقی اپنے عہد سے کبھی بھی غافل نہیں رہے۔ یہی وجہ ہے کہ ایک طرف ذوقی کی کہانیوں میں زمینی مسائل، فرقہ واریت، فسادات کو بنیادی اہمیت حاصل رہی، وہیں ذوقی کی کھلی آنکھوں نے نئے زمانے کے چلن اور تیزی سے بدلتی ہوئی قدروں جیسے موضوعات کو بھی اپنی کہانیوں میں جگہ دی۔ یہی وجہ ہے ایک طرف جہاں وہ بھوکا ایتھوپیا، بچھو گھاٹی، فی الحال، کتناوش، سور باڑی، فنی لینڈ، میں ہارا نہیں ہوں کامریڈ، مت روسا لگ رام، مرگ نینی نے کہا، حیران مت ہو سنگی مترا، لکھ رہے تھے، وہیں انہوں نے بالکل نئے اور اچھوتے موضوعات پر مرد، بارش میں ایک لڑکی، صدی کو الوداع کہتے ہوئے، آپ اس شہر کا مذاق نہیں اڑا سکتے، کاتیائن بہنیں، بھورے بالوں والی لڑکی جیسی کہانیاں بھی لکھیں۔ ان میں کچھ کہانیاں تو اتنی مشہور (متنازعہ) ہوئیں کہ ان کہانیوں کے تذکرے کے بغیر آج کی اردو کہانیوں کے بارے میں سوچا بھی نہیں جا سکتا۔ اردو کے مشہور نقاد ڈاکٹر محمد حسن نے جب اپنے رسالہ 'عصری ادب' میں موجودہ اردو کہانیوں کو لے کر نورتن کی فہرست بنائی تو اس میں سب سے پہلا نام ذوقی کا ہی تھا ـــــ

'مسلمان' ذوقی کی ایک ایسی تخلیق ہے جو ہندوستانی مسلمانوں سے متعلق ہر سوال کا

جواب دینے کے لئے کافی ہے۔ کیا حقیقت میں ہندوستان کا مسلمان عدم تحفظ کا شکار ہے؟ بے روزگاری، جاہلیت، وطن پرستی ـــــ حالات سے مقابلہ کرتے ہوئے، مشکل کی ہر گھڑی میں الزامات کے نشانے پر تیار کھڑے، ہر ایک مسلمان کی آپ بیتی ہے.....'مسلمان'۔

جیسا کہ ذوقی نے اپنے مضامین میں پہلے بھی اس بات کا اشارہ دیا ہے ـــــ

- ہندوستان کے پچیس کروڑ مسلمان آخر کس سے ڈرتے ہیں اور کیوں؟
- آزادی کے پچاس سال بعد بھی مسلمان اس ملک میں اقلیت کہلاتے ہیں ـــــ طاہر محمود جیسے پڑھے لکھے لوگ اقلیتی کمیشن کے چیئرمین بننا منظور کرتے ہیں ـــــ پچیس کروڑ کی آبادی جو ایک ملک کی آبادی سے بھی کہیں زیادہ ہے، وہاں مسلمانوں کے لئے استعمال کئے جانے والے لفظ اقلیت کی کیا حیثیت ہے۔؟
- مسلمانوں کو دوسری بڑی اکثریت کب کہا جائے گا؟ دوسری بڑی اکثریت کی لڑائی ذوقی اپنے قلم سے پچھلے سترہ برسوں سے لگاتار لڑ رہے ہیں ـــــ ہاں، اب کچھ مسلم 'رہنماؤں' نے بھی ذوقی کے اس نعرہ 'دوسری بڑی اکثریت' کو استعمال کرنا شروع کر دیا ہے۔ 'دوسری بڑی اکثریت' کی حمایت میں ہندوستان کے، صرف پچیس کروڑ مسلمان کو ہی سامنے نہیں آنا چاہئے بلکہ دوسری قوم کے لوگوں کو بھی اس انصاف کی جنگ میں مسلمانوں کا ساتھ دینا چاہئے۔
- گاندھی جی کی ہتیا ہوتی ہے، مسلمان اپنے گھروں میں بند ہو جاتے ہیں۔
- اندرا گاندھی، راجیو گاندھی کی آزاد بھارت میں ہتیا ہوتی ہے، مسلمان ایک بار پھر اپنے اپنے گھروں میں بند ہو جاتے ہیں، کیوں؟
- کس سے خوفزدہ ہیں مسلمان؟ یہ خوف کسی دوسرے نے نہیں، بلکہ خود ان کے مسلم رہنماؤں نے ان پر مسلّط کیا ہے۔

ذوقی کے ان کلمات میں وزن ہے۔ 'مسلمان' ایک جنگ ہے، جہاد ہے ـــــ آزادی کے بعد ہندوستان میں یا ہندوستان سے باہر ایسا کچھ بھی ہوتا ہے ـــــ جس کے پیچھے مسلمانوں کا ہاتھ ہو، بھارتیہ مسلمان شک کے گھیرے میں آجاتا ہے۔ پاکستان سے قندھار، داؤد سے اُسامہ بن لادن تک ـــــ 1999ء دسمبر کے آخری دنوں میں انڈین ایئر لائنز کے مغویہ طیارے سے پنٹاگن اور ورلڈ ٹریڈ ٹاور پر حملے تک ـــــ ہر بار نشانہ مسلمان کیوں بنتا ہے۔

ذوقی پوچھتے ہیں جب یہودیوں، انگریزوں، ہندوؤں کو دہشت پسند یا Terrorist کہتے وقت ہم ان کے مذہب کو دہشت پسندی سے نہیں جوڑتے ہیں۔ پھر ساری دنیا میں اسلامی آتنک واد، اسلامی دہشت پسندی یا Islamic Terrorism کا نعرہ کیوں ـــــ؟ اسے بدلنے کی ضرورت ہے، اس کے خلاف بھی ایک جنگ کی ضرورت ہے۔

ذوقی نے مسلمان میں طوائف کا استعارہ پہلی بار استعمال کر کے اپنے قارئین کو چونکایا۔ ایک طرف جہاں طوائفوں کو اچھوت سمجھا جاتا ہے اور بار بار ان کی عزتوں کا سودا ہوتا رہتا ہے۔ ویسے ہی مسلمان بھی اس ملک میں اچھوت بن کر رہ گئے ہیں۔ بار بار مسلمانوں کی عصمت وحرمت کا سودا ہوتا رہا ہے۔

ذوقی کے اس ناول پر ''ملت'' کے نام سے سیریل بھی بن چکا ہے جو دوردرشن سے (DD1, Metro) پر کئی بار دکھایا بھی جا چکا ہے۔

راشٹریہ سہارا (اردو)

کچھ 'مسلمان' کے بارے میں

مشرف عالم ذوقی

تب ہم بچے تھے..... چھوٹے چھوٹے بچے..... یاد نہیں، کہ سروں پر دو پلی ٹوپیاں ہوتی تھیں یا نہیں..... مگر اماں کہتی تھیں کہ چہرے پر نور ہی اتنا ہے کہ، ماشاءاللہ، لڑکا دور سے ہی دیکھنے پر مسلمان لگتا ہے۔ مسلمان ـــــ تب خود پر اتنا فخر ہوتا تھا کہ سارے کے سارے اپنے سامنے حقیر نظر آتے تھے۔ اماں کہتیں ـــــ آیتیں سناؤ، کلمہ پڑھو..... ہم بچے تھے، توتلی زباں سے پڑھتے ـــــ تو ہمیں سننے والا مہمان خوشی سے جھوم جاتا۔ اماں تو جیسے نظر اتارنے بیٹھ جاتیں..... میرے بچے کو بری نظر نہ لگے اللہ!

ہمیں معلوم تھا، ہم کلمہ پڑھتے ہیں اور جو نہیں کلمہ پڑھتے ہیں، وہ کافر..... تب اسکول میں ساتھ ساتھ پڑھنے والے ہندو لڑکوں سے دوستی کرتے ہوئے بھی، دل مانتا نہیں تھا۔ ہم کرتا پائجامہ اور سر پر ٹوپی پہن لیتے تو جیسے اماں ہماری صورت کی بلیاں لینے لگتیں۔

مگر کیا یہ صرف میری اماں ہی تھیں.....

چھوٹا سا تو شہر تھا..... آرہ ـــــ میری اماں، یا غفّار کی اماں یا سلیم کی اماں..... ذرا بھر بھی فرق نہیں تھا کسی میں..... سب اپنے ماحول کی لاشیں ڈھوتے ہوئے اور گھر کے سامنے تھے ہندو وکیل صاحب ـــــ ان کی بیوی چھجے پر آ کر اماں سے باتیں کرتیں..... میں تو اپنے بچوں کو ملکی محلّہ نہ بھیجوں.....

''کیوں.....؟''

''وہاں سب میاں ہیں نا.....''

''میاں ہیں تو کیا ہوا؟''

''ہوگا کیسے نہیں۔ کاٹ ڈالیں گے۔''

تب ہم اسکول میں تھے۔ ہندو لڑکوں میں دوستی تھی اور تب کتنی ہی باتیں صاف ہوتی جا رہی تھیں..... وکیل صاحب کی بیوی کو میئن سے ڈر لگتا ہے ـــــ اس لئے وہ اپنے بچوں کو ملکی محلّہ نہیں بھیجتیں۔ دوسرے یہ، (جو چھوٹے چھوٹے، اپنے ہم عمر لڑکوں سے معلوم ہوتا) کہ مسلمان تو ناجائز طریقے سے ہندوستان پر اپنا قبضہ جمائے ہیں، ورنہ ان کا ملک تو پاکستان ہے ـــــ تب آپس میں شوخیاں بھی ہوتیں۔ نوک جھونک بھی۔ جھگڑے بھی۔ تب کوئی انل ہمیں پیٹ دیتا اور ہم روتے ہوئے گھر آتے تو اماں ہمیں ڈانٹ ڈپٹ کر چپ ہو لیتیں..... اگر غلطی سے ہم نے انل کو پیٹ دیا ہوتا تو اماں جیسے پورا گھر ہی سر پر اٹھا لیتیں..... ''فساد ہو جائے گا۔ دنگا ہو جائے گا۔''

●●

چھوٹی سی عمر..... رومانی تجربوں سے گزرنے کے بجائے، دیکھ رہی تھی ـــــ دہشت ـــــ دیکھ رہی تھی فساد..... دیکھ رہی تھی دھواں ـــــ خون اُگلتے مناظر ـــــ تب خبروں میں، اخباروں میں لگاتار پاکستان، ہندوستان پر بمباری کرتا تھا..... اور ہر خبر کے ساتھ ہم خود کو الزام کے کٹہرے میں پاتے تھے۔ تب لگتا تھا..... آنے والے وقت میں برائٹ فیوچر کے نام پر یہ مسلمان نام کہیں خود کے لئے ایک بددعا ـــــ نہ بن جائے۔ تب لگتا تھا، فیوڈل سسٹم کی ساری کڑیاں ٹوٹ کر بکھرنے کے باوجود بھی، آج کے مہذب سماج میں مسلمانوں کے جھوٹے گلاس کو، کوڑے دان میں پھینکنے کی روایت برقرار ہے۔

●●

تب ہم بھی جینس کلچر میں رنگ گئے تھے۔ رومانی عمر کا خمار بھی کچھ بڑھ چلا تھا۔ اتنا کہ ہم خود کو لنگی اور دھوتی والوں سے زیادہ مہذب اور سیکولر مانتے تھے۔ تب آرا کے چھوٹے چھوٹے 'چاہ خانے' ہوتے تھے ـــــ اور ہم مل بیٹھ کر بڑی بڑی باتوں کے توپ چھوڑتے تھے۔ مگر ساری توپ پھس.....

●●

جلد ہی لگنے لگا.....وہ سب سچ نہیں ہے۔ جو ہم کہتے ہیں ـــــ یہ سب چاہ خانے اور میز تک کا سچ ہے۔ میز کے آگے کی دنیا میں وہی فرقہ واریت کے گدھ بیٹھے ہیں ـــــ جو گھر پہنچتے ہی، دروازے پر قدم رکھتے ہی ہمیں یا تو ہندو بنا دیتے ہیں ـــــ یا مسلمان۔

تب کتنا کچھ محسوس ہوا تھا ـــــ یہ بھی اور وہ بھی.....تب لوگوں نے بتایا کہ یہاں ہم محفوظ نہیں.....مگر پاکستان میں کون سے محفوظ تھے ہم؟

تب لگا.....'سرحد' بنتے ہی ٹوبہ ٹیک سنگھ، تو ہمیشہ کے لئے مر گیا ـــــ

تب لگا..... کہ جو دوسرے کہتے ہیں کہ مسلمان تو یہاں رہ کر بھی پاکستان کی ہی 'ہوا' چھوڑتے ہیں..... یا یہاں کا کھاتے پیتے ہیں اور گُن پاکستان کا گاتے ہیں..... یا کرکٹ میچوں میں پاکستان کی جیت کی خواہش کرتے ہیں..... یا مسلمان غدار ہو گئے ہیں..... یا یہ، کہ انہیں یہاں اچھے رتبے، عہدے ملنا دشوار ہے.....تو سچ کیا ہے؟

بابری مسجد اور رتھ یاتراؤں کی بھیڑ میں ہم کہاں، کتنے موقع پر ننگے ہوئے ہیں ـــــ

تب لگا، باہر کی میز اور گھر کے دروازے پر کھڑے آدمی کے راز کو بے نقاب کرنا ضروری ہے ـــــ

جب اتنا کچھ محسوس تب یہ بھی لگا کہ آج کے مسلمان اور بالا خانے کی طوائف میں کوئی فرق نہیں.....دونوں ہی نکالے ہوئے ہیں۔ کوئی سماج سے، کوئی ملک سے ـــــ

●●

میں نے آج تک جتنا کچھ تحریر کیا، طوائف کا تذکرہ کہیں بھی نہیں آیا۔ حقیقت کی سرنگ میں جھانکنے اور ماحول کو پورا پورا دیکھے بغیر میں کچھ بھی لکھنے کو ادبی ذمہ داری نہیں مانتا.....اور یہ بھی سچ ہے کہ مسلمان، لکھتے وقت بھی میں کسی طوائف سے نہیں ملا، نہ تعارف ہوا ـــــ نہ ان کی زندگی میں جھانکنے کی کوشش کی..... پھر بھی، ان سب کے باوجود آج کے مسلمان پر جب لکھنا چاہا تو احساس ہوا.....سماج سے خارج کی گئی ایک طوائف اور آج کے مسلمان میں کیا فرق ہے.....؟

لگا،..... پارٹیشن کے بعد جو حقارت (نفرت یا بے رخی) بچ گئی ہے، اس کے لئے طوائف سے زیادہ بہتر کردار کون سا ہوگا.....

لیکن مسلمان صرف شہاب الدین تو نہیں ہیں ـــــ مولانا بخاری تو نہیں؟

تب لگا، علم اور جاہلیت کے بیچ بھی کچھ رہ گیا ہے جسے بتانا ہوگا۔

تب لگا، ایک حق آواز تو اپنی بھی ہے، جس میں نہ قناعت ہے، نہ غداری۔ جہاں ایک صاف ستھرا آسمان ہے اور اس آسمان کے نیچے میرے جیسے کتنے ہی مسلمان ہیں.....لیکن ہمارا جائزہ لیتے وقت ہمارے نمائندے شہاب الدین جیسے نیتا ہی بنتے ہیں۔

تب لگا.....اس اندھیرے سے لڑنے کی ضرورت ہے۔

ناول لکھ ہی رہا تھا کہ ایک دوست نے پوچھا ـــــ کیا لکھ رہے ہو؟

جواب دیا.....''مسلمان''

دوست چونک کر بولا ـــــ کوئی آتنک واد کا موضوع چُنا ہے کیا؟

ایک بار پھر اسی مدعے پر ہوں۔ کل کو اگر یہ ناول لکھ رہا ہوتا تو ممکن ہے یہ سننے کو ملتا.....

''کوئی مذہبی چیز لکھ رہے ہو کیا؟'' وقت کے اوراق پر یہ نام آج کسی تھرلر اور دہشت پسندی پر مبنی فلم کا نام بن گیا ہے۔ کیسی عجیب بات ہے.....

آپ کے جواب کا انتظار رہے گا۔

آپ کا

مشرف عالم ذوقی

(1990 ہندی کتاب کا پیش لفظ)

(ترجمہ: نبی احمد)

ہم مسلمان ہیں!

وہ فارس سے آئے تھے
وہ کابل سے آئے تھے
لیکن وہ ملک کی تقسیم کے ذمہ دار نہیں تھے
وہ غدار نہیں تھے

●●

جسم ڈھکنے کے لئے انہیں بھی ضرورت پڑی تھی
دو کپڑوں کی ـــــــ
انہیں بھی بھوک لگتی تھی
تیز دھوپ میں ان کا جسم بھی جھلستا تھا
وہ سردی بھی کھاتے تھے
اور بارش کا سہانا موسم بھی انہیں پسند تھا
لیکن وہ غدار نہیں تھے

●●

وہ محبت کرنا بھی جانتے تھے
اور نفرت بھی
وہ عقیدت بھی رکھتے تھے

اور ان میں ایسے بھی تھے
جو کسی بھی دین کو نہیں مانتے تھے
وہ پانچوں وقت کی نماز بھی پڑھتے تھے
وہ سچ بھی بولتے تھے اور جھوٹ بھی
اس لئے کہ وہ انسان تھے
ان کا رنگ روپ، سب کچھ عام انسانوں جیسا ہی تھا
لیکن وہ غدار نہیں تھے

●●

انہیں بھی موت آتی تھی
اور وہ ہمیشہ کی نیند سو جاتے تھے
بہنیں روتی تھیں/ ہنستی تھیں/
پھر اپنی اپنی گھر گرہستی میں الجھ جاتی تھیں

●●

ان کے بھی بچے تھے
بچے ہنستے تھے، کھیلتے تھے/
لڑتے تھے جھگڑتے تھے/
غصّہ میں آ کر 'آلوک' یا 'رنجن' کو پیٹ بھی دیتے تھے/
یا پٹ جاتے تھے
پھر دوستی کر لیتے تھے
لیکن وہ غدار نہیں تھے

●●

وہ ہر بار آنکھوں میں شک رکھ کر جیتے تھے
وہ ہر بار مسکرا کر،

دوستوں کے درمیان شک، آنکھوں سے اتار کر
جینے کی کوشش کرتے تھے
وہ ڈرپوک بھی تھے
کہ مہاتما گاندھی/ اندرا/ یاراجیو کی
ہتیا پر اپنے گھر کے کمرے میں بند ہو جاتے تھے
مگر وہ غدار نہیں تھے

●●

وہ ہمارے جیسے تھے
وہ تمہارے جیسے تھے
کہ ان کی شریانوں میں
خون کا بہاؤ بھی ہمارے ہی جیسا تھا

وہ فارس سے آئے تھے
وہ کابل سے آئے تھے
وہ دنیا بھر سے آئے تھے
لیکن وہ غدار نہیں تھے

غلامی کے آخری دنوں سے 1986ء تک

(1)

نیلے آسمان پر رہنے والی راتیں، اچانک عرش سے فرش کی دوریاں طے کرتی ہوئی، چاروں طرف سے اسے گھیر کر کھڑی ہوگئی ہیں۔

ہاں، نیلے آسمان میں رہنے والی راتیں ـــــ جن کے بارے میں وہ معصوم سوالوں کی بوچھاریں کیا کرتی تھیں.....

''یہ راتیں، اماں! راتیں نیلے آسمان میں کیوں رہتی ہیں؟''

ـــــ رہتی ہیں.....بس

بس نہیں اماں..... مجھے ان راتوں سے ڈر لگتا ہے، میں ڈر جاتی ہوں.....

●●

نیلے آسمان سے اتر کر راتیں اس کے اردگرد حصار کھینچ کر، اسے خوفزدہ کر رہی تھیں۔

ـــــ کہاں بھاگو گی؟

کہیں بھی

ـــــ بھاگنے کے لئے اب جگہ کون سی بچی ہے.....؟

ہنسنے کی آوازیں.....

کیوں؟

ـــــ تمہارے لئے اب کہیں کوئی جگہ نہیں ہے۔

وہ پسینے میں تر بتر کھڑی ہے

جگہ نہیں ہے؟

ـــــ ہاں جگہ نہیں ہے۔ تم ہو کون۔ پہلے اس سوال کا جواب دو۔ کون ہو تم؟ تمہارا مذہب کیا ہے، تمہارا نام.....نام کیا ہے ـــــ؟

نام.....؟

●●

سر پر سیاہ رات کی چادر تن چکی ہے.....اسے یاد آیا..... وہ خوفزدہ ہے.....سڑکیں خاموش ہیں۔ کتوں کی آوارہ آوازیں رات کے سناٹے میں دہشت پیدا کرنے کے لئے کافی ہیں.....سانس تیز تیز چل رہی ہے.....

جیسے ہزاروں کی تعداد میں کتے اس کے پیچھے لپک رہے ہوں.....

وہ نہ آگے بھاگ سکتی ہے نہ پیچھے ـــــ

سانسیں سوئیوں کی طرح ٹوٹ رہی ہیں ـــــ

نیم شب کے سناٹے کے آسیب، اسے آغوش میں لینے کے لئے کھڑے ہوں ـــــ

ایک پل ـــــ بس ایک لمحہ ـــــ ادھر سانسوں کی سوئیاں ٹوٹیں اور ادھر ـــــ

اس نے خوفزدہ لہجے میں خود سے پوچھا ـــــ تم بھاگی کیوں؟

ـــــ کیوں کہ وہاں دو آسیب.....؟

آسیب نہیں، آدمی ـــــ ہلتے جلتے، ہنستے بولتے، خوشی اور رنج کا اظہار کرتے ہوئے آدمی.....

ـــــ آدمی نہیں ـــــ وہ آسیب نہ سہی، لیکن وہ آدمی بھی نہیں تھے ـــــ

ـــــ آدمی نہیں تھے؟

وہاں دو مذہب تھے۔ بھوکے پیاسے دو مذہب۔ ایک دوسرے پر جھپٹتے ہوئے دو مذہب ـــــ ایک دوسرے پر الزام کی بارش کرتے ہوئے دو مذہب.....اور.....

ـــــ پھر کیا ہوا؟

پھر ـــــ مجھے کچھ پتہ نہیں ـــــ مذہب کے چہرے بدل گئے تھے۔ نہیں ـــــ

''مذہب'' کے چہروں نے ہتھیار تھام لئے تھے۔ ہتھیار ـــــ تیز ہتھیار ـــــ اور میں دروازہ

کھول کر باہر نکل آئی۔

باہر خوفناک رات کا اندھیرا چھٹکا ہوا تھا۔

نیلے آسمان پر رہنے والی راتیں اس پر چاروں طرف سے حملہ کر چکی تھیں ـــــــ اور

وہ ـــــــ

اس نے اس عجیب سی کہانی کو لکھنے کا فیصلہ کر لیا تھا۔

وہ کہانی جو شاید 47ء کی چلچلائی گرمی سے پہلے سے جنم لے چکی تھی ـــــــ

یا ـــــــ

اسے اب سب کچھ یاد آ رہا تھا۔ سب کچھ ـــــــ

(2)

لمحہ لمحہ ایک بکھراؤ ہی تو ہے تمہارے پاس؟

اور اس کے سوا؟

خواہش اور 'گریز' سے الگ کی بھی ایک شاہراہ ہے، جہاں کھڑی ہو تم اور مستقل ایک لڑائی لڑ رہی ہو ـــــــ آنے والے لمحوں کی سنگینیوں سے..... یا وہ لمحہ جو ابھی ابھی تمہارے پاس سے گزرا ہے..... لیکن یہ کیا ہو گیا ہے تمہیں ـــــــ؟ خوف کا یہ موسم کب تک تمہارے ساتھ رہے گا؟ کیا لگتا ہے تمہیں۔ سڑک سے گزرتے ہوئے اچانک ـــــــ انجانے میں پیچھے سے چلی ہوئی کوئی گولی تمہارے چیتھڑے اڑا دے گی۔

تم انجو؟..... کبھی غور کیا ہے..... تمہاری حالت بھی تو.....؟

ڈر گئی کیا؟

نہیں ڈرنا کوئی حل نہیں ہے۔ یوں بھی تم نے ڈرنا کہاں سیکھا ہے ـــــــ تم نے تو جینا سیکھا ہے ـــــــ اُن سخت جان پرندوں کی طرح، جو پانیوں میں ہی رہتے ہیں۔ پانیوں میں ہی جیتے ہیں اور پانیوں میں ہی اپنا رزق تلاش کرتے ہیں۔ ہاں، کبھی کبھی جب خشکیوں پر آ جاتے ہیں، تب بھی اُنہیں کوئی پریشانی نہیں ہوتی۔ کیوں انجو..... تم نے بھی تو خشکی پر رہنا بھی سیکھ لیا ہے ـــــــ ہے نا؟

لیکن کیا سچ مچ؟

●●

دور کہیں آسمان میں ایک تارہ ٹوٹا ہے..... تارے تو ٹوٹتے ہی رہتے ہیں..... ہیں نا؟

اندھیرے سے آسمانی چھت کا جائزہ لیتی ہوئی جیسے وہ ریزہ ریزہ ہوگئی۔ دھک..... دھک..... سینے میں کہیں دور تک کھلبلی مچ گئی..... اندر بیٹھا خوف، دیوار گھڑی کی طرح ٹن..... ٹن گھنٹا مارنے لگا..... رک رک کر..... ٹھہر ٹھہر کر.....

ٹن..... ٹن..... ٹن.....

ٹن..... ٹن..... ٹن.....

ہر رات وہ اپنے جسم سے خوف کی ایسی ہی ایک ڈور کھینچنے کی کوشش میں بکھر جاتی ہے..... پتہ نہیں..... بچپن سے لے کر اب تک..... جسم خوف کی کتنی ہی ڈوریں بندھی ہوتی ہیں..... وہ چاہتی تو ہے ہمت ور بننا..... طاقتور اور مضبوط..... اتنی بڑی دنیا میں..... مردوں کے ظلم وستم اور خوف کی کہانیاں بیان کرنے والی اس دنیا میں..... تن تنہا، یگانہ اور اپنے وجود کی حفاظت اور جنگ میں.....

لیکن رسم ورواج کی جو اتنی ساری بیڑیاں ہیں.....

اور بیڑیوں میں دبا ہے..... خوف؟

خوف.....

سچ..... وہ بچپن سے ہی خوف کے انجکشن لیتی رہی لیتی رہی ہے.....

تاک..... دھن..... تاک..... دھن..... گھنگھروؤں نے اچانک پاس آ کر سرگوشی کی ہے..... ننگے پاؤں نے چم چم چمکتے فرش کا بوسہ لیا..... ساز حرکت میں آ گئے اور سازندے بھی.....

رقص میں لیلیٰ رہی، لیلیٰ کے دیوانے رہے..... گھنگھرو تیز ہوئے۔ نغمے تیز ہوئے..... دیوانوں کے شور وغل اور واہ واہی کی صدائیں تیز ہوئیں..... اور کہیں..... بند دروازے سے جھانکتی دو آنکھیں رقص ومینا کی تکرار میں ان نقرئی قہقہوں کو سنتی ہوئی خوف سے سہم گئیں.....

خوف..... کبھی مجبوری کے عوض، منڈیروں سے جھانکتی وحشیانہ ادائیں بن جاتیں_____

خوف..... کبھی حیرت سے، گھنگھرو اور پائلوں کو گھورتی ہوئی آنکھیں بن جاتیں_____

خوف..... بالا خانے پر آنے والوں کے قہقہوں اور بے ہنگم آوازوں میں اُلجھ اُلجھ جاتیں_____

خوف..... جنہیں ننھی منی سی افروز چیچک کے ٹیکے کی طرح اپنے وجود پیوست کر رہی ہوتی..... اور وہاں..... بالکنی پر ایک قطار سے میلے گندے کپڑے میں ہوتے..... جانگھیائیں..... برا، سایہ_____ ان سب سے عجیب سی بدبو آ رہی ہوتی..... الگنی کی اس دنیا کو ذرا فاصلے سے گھور رہی ہوتیں_____ وہی دو آنکھیں..... اور ان گندے کپڑوں کے بیچ کھڑی ہو جاتی_____ گوہر بائی..... بالکنی پر گاہکوں کا انتظار کرتی ہوئی.....

قطرہ قطرہ خوف اس کے وجود میں بیٹھتا رہا..... رقص جاری رہا.....

سازندے اپنی اپنی دنیا میں کھوئے رہے..... طبلے کی ہر تھاپ پر گوہر بائی کے پیر ناز وادا سے، بے خود ہو جاتے_____

رقص میں لیلیٰ رہی.....

لیلیٰ کے دیوانے رہے.....

گھنگھروؤں کی جھنکار تیز ہوتی..... مینا وساغر کھنک اٹھتے.....

واہ واہ کے بے ہنگم شور اچانک خوف میں تبدیل ہو جاتے_____ جسے وہ لمحہ لمحہ اپنے جسم میں پیوست کر رہی ہوتی.....

ہاتھ میں کتاب..... آنکھوں میں الجھنوں کے سائے..... دل ودماغ میں بسی ہوئی ساغر ومینا کی گونج_____ جماعت میں ایک طرف چپ چپ بیٹھی، سوچ میں ڈوبی، ہنسی قہقہوں، ٹھٹھول سے الگ..... گھر میں آنے والے عجیب عجیب چہروں والے مردوں کا تصور..... یہ سب.....؟ وہ بند کمرے میں پڑھنے بیٹھتی تو یہی گھنگھروؤں کی تھاپ ہوتی اور وہ انجانا سا خوف ہوتا.....

کیوں کہ اس وقت تک اس نے یہ نہیں جانا تھا کہ.....

ہاں، وہ کون ہے؟

گھنگھروؤں کا رستہ تو ہر عبادت گاہ تک جاتا تھا.....

ہر دروازے تک.....

وہ کون ہے.....؟

اس وقت تو یہ آواز کانوں میں کہیں نہیں گونجی تھی..... تب وہ صرف افروز تھی..... گوہر بائی کی لڑکی..... گوہر بائی_____ جس کا کوٹھا سب کے لئے کھلا تھا..... کیا ہندو کیا مسلمان.....

اور کوٹھے کی تو خوبی بھی یہی ہے.....

ساری ندیوں کو پی کر سمندر بن جانا.....

لیکن افروز.....وہ تو زہر پینے میں لگی تھی۔قطرہ قطرہ.....

●●

یادوں کی وادیاں گھنی ہوئیں تو ایک گورا گورا مردانہ ہاتھ چمکا..... ہاتھ میں لاٹھی تھامے..... براق سفید کرتا پائجامہ..... پیروں میں ناگرہ..... منہ میں پان کی گلوریاں دابے۔ آہستہ آہستہ اس کے سر پر ہاتھ پھیرتے ہوئے۔

الطاف حسین.....نواب الطاف حسین۔

وہ سر جھکائے نواب صاحب کو کنکھیوں سے دیکھ رہی تھی.....

گوہر بائی کے چہرے پر رونق آ گئی.....کمھلائے چہرے کی خزاں ایک لمحے کو بہار میں تبدیل ہوئی_____ مسکرائیں.....

مسکرائے نواب صاحب بھی.....پھر آہستہ سے اٹھے.....

''اچھا، چلتا ہوں گوہر جان.....''

بہار پھر خزاں میں کھو گئی.....

''یہ بھی کوئی آنا ہوا نواب صاحب.....''

''آنے اور جانے کا سلسلہ تو لگا ہی رہتا ہے گوہر جان.....''

وہی مسکراہٹوں کا تبادلہ_____

خاموشی.....

اٹھتی چڑھتی سانسیں اور_____

دبا دبا سوال.....

''پھر کب آئیں گے نواب صاحب؟''

اس نے محسوس کیا، بائی اماں کی نکھوں کی پتلیاں لرز رہی تھیں.....زمین پر لاٹھی گھماتے ہوئے مسکرائے تھے الطاف حسین.....

''آتا ہی رہتا ہوں.....''

بائی اماں کی آواز بوجھل ہو گئی.....

''بہت زیادہ ان آنکھوں کو انتظار نہ کرائیے گا نواب صاحب۔''

نواب صاحب اس بار پھر مسکرائے_____ ایسی مسکراہٹ، جس کے بارے میں وہ سوچ میں پڑ گئی کہ آیا یہ مسکراہٹ ہے بھی یا نہیں.....اتنی پُراسرار.....اتنی عجیب سی.....

نواب صاحب نے لاٹھی دھیرے سے گھمائی اور چپ چاپ دروازے سے نکل گئے۔

خالی دروازہ.....ٹھنڈی سانس لے کر اس خالی خالی دروازے کو دیکھتی رہ گئی تھیں بائی اماں.....

پھر کمرے سے چلی گئیں.....

نواب صاحب کا گورا چہرہ دیر تک ننھی افروز کی آنکھوں میں چبھتا رہا.....

اور.....

پھر وہی خوف.....

وہ خوف سے الگ کیوں نہیں ہوتی.....؟

وہی بے جان سے.....گلی کے کسی کونے میں پھینکے ہوئے 'گندے' کے خون آلودہ ٹکرے کی طرح.....گھناؤنے، الٹی کرنے جیسے کچھ منظر.....

وہی الگنی پر ٹنگے بائی اماں کے گندے میلے کپڑے.....برا، جانگھیائیں.....سایہ.....

وہ غور سے دیکھتی ہے.....جیسے اچانک یہ کپڑے سنڈاس میں بدل گئے ہوں اور ان پر ہزاروں مکھیاں بھنبھنانے لگی ہوں.....

'انہیں بائی اماں.....پہنتی ہیں نا؟ ہر روز؟'

'اور ہر دوسرے دن یہ گندی بھی ہو جاتی ہیں.....'

دھیرے سے آگے بڑھ کر وہ ہاتھ کی ننھی ننھی انگلیوں سے کپڑوں کو مس کرتی.....

کپڑوں پر پڑے بے شمار داغ.....لیکن داغ کہاں تھے.....سب تو وہم تھا اس کا.....لیکن اسے گھن کیوں آتی ہے؟

کیوں آتی ہے؟

وہ دالان خانے سے ہوتی ہوئی باہر آتی تو اسے پتھروں کے اونچے فرش کے پاس بدی

ماما نظر آتے ـــــ بے زبان گائے کی طرح سر جھکائے..... بائی اماں کے چہیتے دلال.....

بائی اماں کے زیر جامہ کو صابن کے جھاگوں سے نچوڑتے ـــــ کپڑے پیٹنے والے لٹھ سے پیٹتے.....

انہماک سے اپنے کام میں کھوئے..... گائے جیسے سیدھے بدّی ماما.....

بائی اماں کی جھڑکیاں ان کے کانوں سے ایسے گزرتیں جیسے اندھا، پاس سے گزرتے کسی آدمی یا سواری سے ٹکراتے ٹکراتے بچ جاتا ہے..... اور اسے کوئی خبر نہیں ہوتی.....

''کیوں رے بدی..... کھانا تو تینوں وقت ٹھونستا ہے اور کپڑے دھونے میں جان نکلتی ہے تیری۔ یہ کپڑے دھوئے ہیں۔ کیوں رے موئے۔ کیڑے پڑیں تیری قبر میں..... گاہک بھی چن کر ایسے لاتا ہے جیسے پیدائش سے اکنّی کا منہ تک نہیں دیکھا ہو۔ اپنی ماں کے پاس لے جانے میں شرم آتی ہے جو میرے پاس لے آتا ہے۔''

بائی اماں کا چہرہ غصّے سے لال ہو جاتا ہے۔

''کیوں رے بدی..... میں اتنا بولے جا رہی ہوں، تجھے کچھ ہوش بھی ہے یا نہیں۔''

بدی ماما ویسے ہی گئو بنے کپڑے پیٹ رہے ہوتے۔

وہ کسی گوشے سے یہ سارا تماشہ دیکھ رہی ہوتی۔

اور وہی خوف..... والا..... کیڑا.....

''بدی ماما چپ کیوں رہتے ہیں؟''

''..... بائی اماں کی اتنی ساری گالیاں کیسے پچا لیتے ہیں؟''

اور.....

''نواب صاحب ان کے یہاں روز روز کیوں آتے ہیں.....؟''

اور.....

''ـــــ بدی ماما عجب عجب چہروں والے مرد کیوں لاتے ہیں؟''

''ـــــ ان مردوں سے بائی اماں کا کیا رشتہ ہے؟''

اور.....

''ـــــ الگنی پر ٹنگے بائی اماں کے گندے میلے کپڑے.....؟''

سوال سنڈاس کے پلوؤں کی طرح اسے گھیر کر کھڑے ہو جاتے..... کبھی نہ ختم ہونے

والے سوال۔

ایک قطار سے کھڑے سوال..... کبھی نہ ختم ہونے والی قطار..... یہ قطار بہت دور تک جاتی تھی..... اتنی دور..... جہاں تصور کے ایندھن کی گرمی اسے جانے سے روکتی تھی..... تب آج کی طرح پاخانے نہیں بنے تھے..... موزیک..... فلیش والے..... چمچماتے..... خوشبودار/ مہکتے.....

تب..... وہاں جانے کے تصور سے بھی وہ پناہ مانگتی.....

اسے گھن آتی.....

جی متلانے لگتا..... کھلا سنڈاس..... پتھر کے دو بڑے ٹکڑوں کے بیچ کافی چوڑا کھلا منہ..... نیچے جمع ہوتا پائخانہ..... وہ اکڑوں بیٹھی ہوتی..... کنکھیوں سے دیکھتی..... پاخانے پر ڈھیر سارے پلّو رینگ رہے ہوتے.....

ڈھیر ساری مکھیاں ہوتیں..... جو ان پر بھن بھن کر رہی ہوتیں.....

چھی.....

اسے ابکائی محسوس ہوتی.....

تیز نفرت.....

بائی اماں نے نواب صاحب سے کتنی ہی بار کہا ـــــ ''کم از کم پاخانہ تو پکا کروا دیجئے نواب صاحب۔''

بدلے میں نواب صاحب ایک جھوٹی تسلی اچھال جاتے..... ''فکر کیوں کرتی ہو گوہر بائی..... اس بار آیا تو آدمی ساتھ لاؤں گا..... ہو جائے گا۔''

●●

سنڈاس..... اور پاخانے پر رینگتے ڈھیر سے پلّو.....

اٹھتی ہوئی تیز بدبو.....

وہ ناک بند کرتی ـــــ پھر سوچتی.....

بدّی ماما، بائی اماں کے لئے عجب عجب چہروں والے مرد کیوں لاتے ہیں ـــــ؟

انجو کو ایک بار پھر خوف محسوس ہوا..... کہیں دور آسمان میں ایک تارا ٹوٹا..... اور ایک

لکیر سی بنتی چلی گئی.....وہ اٹھ کر بالکنی پر آ گئی.....

میٹروپلٹن شہر کی خوبصورتی میں اضافہ کرتی کئی کئی منزلہ عمارتیں ـــــ اور یہ بھوت بنگلہ.....

جہاں وہ اکیلی رہتی ہے..... اس درمیان اس نے کتنے ہی گھر بدلے۔ تجربوں، حادثوں اور واقعات کے کیسے کیسے جنگل سے گزری۔

ایک بار تو.....اتر پردیش کے کسی گاؤں سے بھاگ کر آئی ہوئی ریوتی بھی کچھ دن تک اس کے ساتھ رہی تھی۔ پھر ایک اکاؤنٹ کلرک سے دوستی ـــــ پھر شادی کر کے اسی کے ساتھ چلی گئی۔ ریوتی ہو یا شیاما.....اس نے کتنے چہرے دیکھے ہیں۔ زندگی کے کتنے رنگ.....

اور یہ بھوت بنگلہ.....تنہائی کا جان لیوا احساس۔

اکیلی لڑکی اور زمانے بھر کی گھورتی نگاہیں.....

●●

آہستہ آہستہ وہ اس اکیلے پن کی عادی ہوتی چلی گئی.....شروع شروع میں اس نے کوشش کی تھی کہ کسی گرلس ہوسٹل میں کوئی جگہ مل جائے.....لیکن یہاں بھی سیاست کے داؤں پیچ ایسے تھے کہ اسے کامیابی نہیں مل سکی.....

ہاں وہی خوف..... جب وہ سب کچھ چھوڑ کر یہاں آ گئی تھی، تب بھی یہ خوف اس کے ساتھ تھا۔

اس کے وجود سے دیمک کی طرح چمٹا ہوا.....

بالکنی اور آسمان..... پتہ نہیں کتنی دیر تک وہ اندھیرے کی آسمانی چادر کو گھورتی رہی.....

سب کچھ حسب معمول رہتا تو شاید اس کی ضرورت نہیں پڑتی.....

لیکن.....

بالکنی سے نظر آنے والی، کئی کئی منزلہ عمارتیں بھی خوف کا احساس پیدا کر رہی تھیں۔

جیسے آدم قد بھوت ہوا میں لہرا لہرا رہے ہوں.....

اسے نوچ رہے ہوں.....

اسے کٹّی کٹّی کر رہے ہوں.....

اس نے لمبا سانس لیا.....

شاید وقت بدلا تھا.....

وقت کے ساتھ چہرے بدلے تھے۔

نظریے بدلے تھے.....آدمی بدلے تھے۔

یہاں بھی وہی.....لیکن آج کیا ہوا تھا.....کوئی غیر معمولی واقعہ.....؟ کیا ہوا تھا.....

بس اتنا.....؟

اس کا دل کراہیت سے بھر گیا.....

یہ کون سی صدی ہے انجو؟

یہ ملک اب کیسا ہو گیا ہے؟ یہ آدمی آدمی میں اسے راکشس کیوں نظر آنے لگے ہیں.....اس نے تو کتابوں میں غلامی سے لڑنے والے مجاہدوں کی کہانیاں پڑھی تھیں.....آپسی دوستی کی ـــــ محبت کی ـــــ بھائی چارگی کی؟

وہ سب کتابوں کا جھوٹ نہیں تھا تو یہ کیا تھا.....؟

جو آج ہوا۔

اور جو مستقل، ایک مدت سے وہ دیکھ رہی ہے..... بدلی ہوئی ہوا کو،..... بدلی ہوئی آنکھوں کو..... بدلتے ہوئے نظریے کو ـــــ اور ملک کے نقشے پر کسی سادھو کی طرح دھنی رما کر جم جانے والے ایک ہی موسم کو.....خونی موسم کو.....

مگر.....آج کیا ہوا تھا انجو؟

تم اتنی خوفزدہ کیوں ہو؟

تنہائی سے؟ اکیلے پن سے؟ یا.....

●●

نہیں.....اسے یاد آیا.....آج بھی وہ ذرا دیر سے گھر لوٹی تھی.....لوٹتے وقت اچانک ہی اس نے ان خونخوار چہروں کو دیکھا تھا..... ہاتھوں میں مشعل لئے.....اندھیرے میں تیز تیز نعرے لگاتے لوگوں کو.....بھیڑ کی شکل میں.....وہ اتنے خونخوار نظر آئے کہ وہ خوف سے بھر گئی اور ایک طرف کنارے کھڑی ہو گئی۔ جلوس کچھ زیادہ ہی لمبا تھا۔ سڑک زیادہ چوڑی نہیں تھی۔ ہلکا اندھیرا شہر کے آسمان پر پھیل چکا تھا اور اسے فضا میں چاروں طرف معلق جلتی ہوئی مشعلیں دکھ رہی تھی۔

خونخوار نعرے اور تیز تیز بڑھتے قدم.....

اسے محسوس ہوا، اگر یہ سچائی جان گئے تو.....تو.....؟

اچانک یہ ساری مشعلیں اس کے جسم میں پیوست ہو جائیں گی۔ ایک ساتھ یہ سارے مل کر اس پر حملہ کر دیں گے.....

اس کا سارا بدن پسینے میں نہا گیا.....اس نے ہاتھ میں مشعل اٹھائے ان خونخوار چہروں کو دیکھا جو نعرے لگاتے آگے بڑھ رہے تھے.....

''جس ہندو کا خون نہ کھولا
خون نہیں وہ پانی ہے
جنم بھومی کے کام نہ آئے
وہ بیکار جوانی ہے''

مشعلیں دھیرے دھیرے اندھیرے میں کھوتی چلی گئیں۔ سناٹے میں صرف وہ رہ گئی.....

اور خوف سے کانپتا اس کا جسم.....

مشعلیں آگے بڑھ گئیں.....

آگے.....آگے.....بہت آگے.....

وہ بالکنی پر تنہا رہ گئی ہے.....رات ڈوبنے لگی ہے۔ کتوں کے شور تھم گئے ہیں.....

وہ بھیڑیے کہیں نہیں ہیں.....

وہ بھیڑیے اب اسے کہیں نظر نہیں آ رہے ہیں.....

وہ بھیڑیے، جن کی وجہ سے اس نے خود کو اندھیرے کی چادر میں چھپا لیا ہے۔

وہ کون ہے؟

سناٹے میں سینے کی اتھل پتھل اور سانسوں سے ایک گونج پیدا ہوئی ہے.....

وہ کون ہے؟

ہاں.....وہ کون ہے.....؟

وہ_____؟

اسے محسوس ہوا_____ وہ سچ بولنے لگی اور سب چونک جائیں گے۔

اندھیرے میں اس کے کانوں میں بائی اماں کے گھنگھروؤں کی آواز اب تک سنائی دے رہی تھی.....

(3)

ایک پناہ گاہ سے نکل کر دوسری پناہ گاہ میں_____

ایک چھوٹی سی عمر میں انسان کیسی کیسی پناہ گاہیں تلاش کرتا ہے۔ فرنگی بیڑیوں سے ملک آزاد ہونے کو ہوا تو مسلمانوں نے اپنی ایک الگ پناہ گاہ ڈھونڈ لی..... پاکستان۔

منٹو کا ''ٹوبہ ٹیک سنگھ'' بھلے ہی ہندوستان اور پاکستان میں فرق نہ کر پایا ہو لیکن پاکستان جانے کی تیاریاں کرنے والے مسلمانوں کو پاکستان کے بارے میں بخوبی معلومات تھی.....یعنی ان کا اپنا ملک_____ مسلمانوں کا ملک_____ اپنے بھائیوں کا ملک_____ اور تصور کی ایک سادہ کتاب تھی جس پر خیالوں کے نئے نئے گل بوٹے بنائے جا رہے تھے۔

چونڑا بستی.....

بہار.....بھوجپور کے نقشے میں آج بھی یہ بستی موجود ہے۔ لیکن کل والی بات کہاں۔ اب تو یہاں کی دنیا ہی مختلف ہے۔ 47ء کے آس پاس جب ہندو مسلم دنگے تیز ہوئے اور چاروں طرف مار کاٹ مچ گئی تو تباہی کا یہ طوفان رفتہ رفتہ چونڑا بستی بھی پہنچا_____ تقریباً پچاس باون گھر ہوں گے اس بستی میں.....آگے لکھی پور ہے، یہاں پر بھی اتنی ہی آبادی ہوگی۔ ان دونوں بستیوں کو ایک چھوٹی سی ندی جوڑتی ہے، جہاں ڈباؤ بھر پانی ہے اور مچھلیاں اس قدر کہ زیادہ تر لوگ مچھلیاں پکڑنے اور شہر جا کر بیچنے کا روزگار کرتے ہیں۔ لکھی پور بستی میں مسلمانوں کی تعداد زیادہ ہے تو چونڑا بستی میں اہیروں کی۔ وہاں بس گنتی کے مسلمان ہیں_____ یہی، لے دے کر بس دو چار گھر۔

لکھی پور کے مسلمانوں نے مار کاٹ کی تو چونڑا بستی میں بھی تناؤ کی فضا بن گئی.....

وہاں کے پرمکھ بانکے چودھری نے دوپہر کے وقت، حالت کو نازک جانتے ہوئے میٹنگ بلالی ـــــ لوگ جمع ہوئے، باتیں ہوئیں ـــــ آپسی رائے مشورہ ہوا۔ پھر طے پایا ـــــ چاروں گھر کے مسلمان مال واسباب کی پرواہ نہ کرتے ہوئے اپنا اپنا گھر چھوڑ دیں اور پڑوس کے ہندو گھروں میں چلے جائیں۔ پناہ دینے کے لئے سب تیار ہو گئے ـــــ پرمکھ کو خطرہ اس بات کا تھا کہ لکھی پور میں ہندوؤں کی بربادی کا سن کر پچھم ٹولہ کے ہندوؤں کا فرمان پہنچا تھا کہ چونڑا بستی کے مسلمان صاف کر دیئے جائیں۔ عین وقت پر پرمکھ بانکے چودھری نے اپنے اپنے گھروں میں مسلمانوں کو چھپانے اور پناہ دینے کا فیصلہ کر کے ایک بہت بڑا جوکھم اٹھالیا۔ ان میں سے ہی ایک خاندان تھا، شیخ سلیم کا۔ بیوی آمنہ کے علاوہ، جوانی کی دہلیز کو چھوتی ہوئی دو لڑکیاں عزیز النساء ـــــ اور امیر النساء۔ عزیزن کی عمر ابھی صرف اٹھارہ سال کی رہی ہوگی۔ مگر جسم ایسا کہ اچھے اچھوں کا ایمان ڈول جائے۔

امیرن اس سے چھوٹی تھی۔ اس پر بھی شباب بس جھوم کر آیا چاہتا تھا۔ شیخ سلیم کے مکان کے پاس ہی للن یادو کا مکان تھا۔ جن کے، کوئلے کی دلالی کرنے والے لڑکے ویریندر یادو کی نظر عزیزن پر تھی۔

بانکے چودھری نے شیخ سلیم کے گھر جا کر بھی مشورہ کیا تھا ـــــ

''سامان کی بالکل فکر نہ کریں۔ آپ ہمارے ساتھ چلیں۔ ہمارے گھر کو اپنا گھر سمجھیں۔''

شام کا کوئی سات بجا ہوگا۔

چراغ ٹمٹما گئے تھے۔ سامان باندھے جا رہے تھے کہ دروازے پر دستک ہوئی۔ شیخ سلیم نے عزیزن کو اشارہ کیا۔ عزیزن آگے بڑھی اور اچانک ٹھٹک گئی۔

''ویرا تو؟''

دروازے کی آڑ لے کر ہونٹوں پر بھدی سی ہنسی سجائے ویریندر، جسے سب ویرا بھی کہتے تھے، کھڑا تھا۔

''کیا ہے؟'' عزیزن کو غصّہ آ گیا۔

''کیوں، کہاں کی تیاری ہے؟''

''جہنم کی.....''

''اس سے بہتر جگہ تو میرا گھر ہے۔''

ویرا نے ایک بھدّا سا قہقہہ بلند کیا۔

شیخ سلیم دروازے تک آتے آتے کانپ گئے۔ ویرا کی ناپاک نیت کو بھانپ گئے۔ مگر کیا کرتے۔ وقت نازک تھا..... زمانہ بدل چکا تھا..... وہ یہاں تعداد میں بھی کم تھے۔ پورے ملک میں دنگوں کی آگ بھڑکی ہوئی تھی۔ جو جہاں زیادہ تھے وہیں آبروریزی کا کھیل، کھیل رہے تھے۔

شیخ سلیم کانپ گئے۔ یہاں تو وہ مٹھی بھر ہیں..... دروازے پر بھدی ہنسی ہنستا ویرا کھڑا ہے۔ صلح صفائی سے کام نہ لیں تو اور کیا کریں..... آگے بڑھے.....

''کیا بات ہے ویرا؟''

''عزیزن میرے ساتھ جائے گی۔''

ویرا کے چہرے پر وہی آگ روشن تھی جو اس وقت ملک کے حاشئے پر سلگ رہی تھی۔

شیخ سلیم اس سے پہلے کہ کچھ کہنے کی کوشش کرتے، ویرا نے انہیں دھکا دیا۔ عزیزن، امیرن کی تیز چیخ ایک ساتھ آسمان کے پردوں کو چیرتی چلی گئی۔

اور اچانک منٹوں میں وہ ہو گیا جو ان کے خواب وخیال میں نہ تھا۔ اچانک پورا نظارہ بدل گیا۔ دروازے پر لٹھ لئے للن یادو کے ساتھ بانکے چودھری اور گاؤں کے ہی ایک دو آدمی کھڑے تھے..... ویرا نے غصّے میں اپنے پتا للن یادو کو دیکھا..... پھر اندھا دھن بھاگتا چلا گیا.....

للّن یادو آگے بڑھے..... عزیزن کے سر پر پیار سے ہاتھ پھیرا..... شیخ سلیم سے بولے.....

''بالکل مت گھبرائیے شیخ صاحب! آپ کی لڑکی ہماری لڑکی ہے۔ ویرا سے تو ہم بعد میں سمجھیں گے۔ آپ بالکل پریشان نہ ہوں۔''

●●

بانکے نے مسلمانوں کو تحفظ دیا، لیکن آن میں پچھّم پورہ میں یہ بات جنگل کی آگ کی طرح پھیل گئی کہ چونڑا بستی کے مسلمان بھاگے نہیں ہیں بلکہ وہاں کے ہندوؤں نے انہیں اپنے اپنے گھر میں چھپا رکھا ہے ـــــ کہتے ہیں یہ خبر پھیلانے والا ویرا تھا، جو پورے گاؤں سے بیر

لیے بیٹھا تھا.....اور انتقام کی آگ میں سلگ رہا تھا۔

نفرت کے لاوے کچھ تھم گئے تو نئی پناہ گاہوں کی تلاش شروع ہوئی۔ افسران، اعلان کرتے پھر رہے تھے کہ کسی پر بھی کوئی زور زبردستی نہیں ہے..... جو لوگ اپنی مرضی سے پاکستان جانا چاہتے ہیں، جا سکتے ہیں۔

اس اعلان کا پاکستان جانے والے مسلمانوں نے خیر مقدم کیا ـــــ یا ان مسلمانوں نے، جو اپنے سامنے اپنے گھر بار اور اسباب کی تباہی دیکھ چکے تھے۔ جن کا دل ہندوستان سے بھر گیا تھا اور اب وہ پاکستان میں اپنی نئی دنیا بسا کر نئی زندگی شروع کرنے کا خواب دیکھ رہے تھے۔

اس اعلان کے بعد بانکے چودھری نے گاؤں کے چاروں مسلمان خاندان کے افراد سے بات چیت کی۔ دو خاندان تو یہیں رک گئے۔ لیکن شیخ سلیم اور باقی بچا ایک خاندان پاکستان جانے پر بضد نظر آیا۔ جبکہ بانکے چودھری اور دوسرے کئی لوگوں نے بہت سمجھایا کہ اگنی پرکشا کی گھڑی ٹل چکی ہے۔ اب کوئی خطرہ نہیں ہے۔ سب بھائی بھائی ہیں۔ سب مل جل کر رہیں گے.....

لیکن نفرت کی آندھی اپنا کام کر گئی تھی ـــــ

سامان باندھے گئے.....

گھراونے پونے بیچ دیا گیا.....

مٹھری، گٹھریاں بندھ گئیں.....

بیل گاڑی ٹھیک ہوئی.....

عزیزن نے آخری بار مکان پر نظر ڈالی..... پھر تھم سی گئی..... سب کچھ چھوٹ جائے گا، نا..... در و دیوار..... یہ مٹی..... یہ پیڑ پودے..... یہ چاہتوں کے خزانے، سب کچھ..... ممکن ہے سب کچھ مل جائے..... مگر یہ گھر، یہ مٹی، یہ آنگن اور ان سے لگاء..... پتہ نہیں تب تک کتنا کچھ بدل چکا ہو..... اس نے ٹھنڈی سانس بھری۔ آنکھیں نم ہو گئیں..... دوسری طرف منہ سے بیری لگائے، بھدے ہونٹوں سے مسکراتا ویرا کھڑا تھا ـــــ اسے دیکھ کر ویرا نے بیڑی پھینکی، پیروں سے مسلا اور پیچھے پیچھے چل پڑا۔

عزیزن کا دل دھک سے رہ گیا۔

''اسی قافلے کے مسافر تھے ہم
جو بچھڑے تو پھر دور چلتے رہے

کوئی راستہ تھا نہ منزل کوئی
کہیں کوئی بھی سائباں تک نہ تھا
کہیں دور تک آسمان بھی نہ تھا
جو بچھڑے تو پھر دور چلتے رہے
جو بچھڑے تو پھر دور چلتے رہے''

پاکستان جانے والوں کا ایک لمبا قافلہ تھا..... اتنے سارے لوگ..... پورا گھر، پر اٹھائے ـــــ مال و اسباب کا بوجھ لئے..... حیران و پریشان..... ایک خیمے سے دوسرے خیمے تک..... ایک پناہ گاہ سے دوسری پناہ گاہ.....

یہ سب عزیزن کے لئے نیا تھا۔ اتنے سارے لوگ تو اس نے کبھی ایک ساتھ دیکھے نہ تھے۔ پاکستان جانے والوں کا قافلہ اللہ اکبر، نعرۂ تکبیر کی صدا بلند کرتا ہوا منزل بہ منزل رواں تھا۔ اچانک قافلے میں کسی بات سے بھگدڑ مچ گئی..... کچھ لوگوں کے بیچ مارا ماری ہو گئی.....

بھگدڑ مچی تو لوگ ادھر اُدھر بھاگنے لگے.....

بھیڑ میں عزیزن کا ہاتھ امیرن سے کب چھوٹا، کچھ پتہ بھی نہ چلا۔ عزیزن کو بس امیرن کی ایک زوردار چیخ یاد رہی تھی۔ پھر دماغ جیسے ڈوبتا چلا گیا..... کب، کیا ہوا، کیسے ہوا..... اسے بس اتنا یاد تھا کہ وہ بھاگتے ہوئے لوگوں کے پیروں کے نیچے آ گئی تھی..... امیرن کا کیا ہوا، نہیں معلوم۔ شیخ سلیم کہاں گئے..... وہ نہیں جانتی..... آنکھ کھلی تو ایک تنگ سی کوٹھری تھی۔

چارپائی پر وہ بے سدھ پڑی تھی۔ اور پاس ہی ویرا شراب کے نشے میں دھت، بھدے انداز میں ہنستا ہوا ہوا بیڑی پھونک رہا تھا۔

●●

ایک پناہ گاہ سے نکل کر دوسری پناہ گاہ ـــــ
'تم ذلّت بھی دیکھو گے
اس لئے تم نے تاج پہنا تھا/
اس لئے کہ تم نے حکومت کی تھی/
اس لئے تم نے خوشحالی دیکھی ہے/

تم ویرانی بھی دیکھو گے/
تم زوال بھی دیکھو گے/
تم اپنی شکست بھی دیکھو گے/
اس لئے کہ تمہیں سکون میسر نہیں ہے/
تم اپنی پناہ گاہیں بدلتے رہتے ہو/

وقت نے عزیزن کی کہانی تو کب کی ختم کر دی.....اس کے پاؤں میں کب گھنگھرو کے چھلّے آئے، پتہ بھی نہ چلا ـــــ لیکن وہ چھلے زیادہ دن تک اپنے پاؤں میں نہ باندھ سکی۔ تب رانی منڈی میں عزیزن کی دو ایک جھلک دیکھ کر ہی اس کے تذکرے زور و شور سے ہونے لگے تھے۔ لیکن عزیزن آخری وقت تک ان اداؤں میں خود کو باندھ نہ سکی ـــــ شیخ گھرانے کے خاندانی پن کا اتنا تو اثر باقی تھا، کہ جب پہلی بار ویرا نے اسے کوٹھے پر بیچا تھا تو اس نے غصّہ میں اس کے منہ پر تھوک دیا تھا۔

''ویرا، کوئلے کی دلالی تجھے اس مقام تک لے آئے گی، میں سوچ بھی نہیں سکتی تھی۔''

وہ کوٹھے پر ویرا کا تین ماہ کا حمل لے کر آئی تھی۔ شہناز بائی سے اس نے صاف صاف کہہ دیا تھا۔

''یہ بچہ جیسے بھی ہوگا، وہ پیدا کرے گی ـــــ پھر اس کے بعد ساری زندگی وہ اس کے اشاروں پر ناچے گی۔''

شہناز بائی نے حامی بھر لی تھی۔

اس طرح عزیزن نے گوہر کو جنم دیا اور ہمیشہ کے لئے آنکھیں موند لیں۔ شہناز بائی سے کیا ہوا وعدہ بھی پورا نہیں کیا کہ وہ ساری زندگی اس کے اشاروں پر ناچے گی.....شہناز بائی نے صبر کیا اور ننھی سی جان گوہر کو پالنے، بڑا کرنے میں لگ گئیں۔

یہ قصّہ 1949ء کی پت جھڑ کا ہے، جب ایک نئے آزاد ملک کو نئے نئے منصوبوں سے سجانے سنوارنے کی تیاری چل رہی تھی۔

اور کچھ ایسی ہی تیاری شہناز بائی بھی کر رہی تھی ـــــ گوہر کو مکمل طور پر بائی بنانے کی تیاری ـــــ

(4)

''تم.....تم نے کیا دیا ہے الطاف حسین..... مجھے؟ ملک اور قوم کی بات کرتے ہو تم.....کیا دیا ہے تم نے اس ملک کو.....قوم کو.....اور دے ہی کیا سکتے ہو تم.....تم مسلمان.....''؟

''تم تو اپنی جوانیاں بیچنے آتے ہو یہاں ـــــ اپنی جوانیاں لٹانے ـــــ اور بدلے میں ہاتھوں پر ریشے اور چہرے پر جھریاں لے کر واپس جاتے ہو.....کل سے آج تک یہی تو تواریخ رہی ہے تمہاری..... ہاں ہم نے دیا ہے الطاف حسین..... ہم نے..... ہم نے کوٹھا دیا ہے.....بالا خانے کی داستانیں دی ہیں اور بھی سننا چاہتے ہو.....''

چھن.....چھن.....

ذہن کے کسی گوشے میں اب تک دھماکے ہو رہے ہیں.....

بائی اماں کو پہلی اور آخری بار اس نے لڑتے پایا تھا۔ دروازے کی دہلیز سے لگی آنکھیں نواب صاحب کو دیکھ رہی تھیں۔ جو آہستہ آہستہ غصّہ میں پیچ و تاب کھاتے ہوئے لاٹھی پر لاٹھی گھمائے جا رہے تھے۔

بائی اماں کی آنکھوں سے ادھر آنسوؤں کی لڑیاں جاری ہوئیں ـــــ اور ادھر نواب صاحب شکست خوردہ انسان کی طرح باہر نکل گئے.....ہکّے بکّے بدی ماما کو بائی اماں نے زور زور سے پھٹکارا تھا۔

''کیوں رے کلموہے..... کیڑی پڑیں تیری قبر میں۔ سیدھے دوزخ میں جائے..... آنکھ کے پپوٹے اور جلی روٹیاں تیرا انصیب بنیں.....کھڑا کھڑا منہ کیا دیکھ رہا ہے بھڑوا نامرد..... تیری سات پشتیں ہجڑے پیدا ہوں۔''

بائی اماں پاگل سانڈ کی طرح ٹکّر مار رہی تھیں ـــــــ

بدی ماما نے دھیرے سے ایسے ہوں کی، جیسے بائی اماں نے منہ سے گالیوں کے نہیں پھولوں کے تحفے بھیجے ہوں۔ چہرہ حکم کی تعمیل میں جھکا ہوا..... بائی اماں بکتی جھکتی ہوئی آگے بڑھیں اور ننھی افروز کو بانہوں میں بھینچ کر رو پڑیں۔

افروز بس دیکھتی رہ گئی.....

یہ سب..... یہ کیا ہوا.....؟

وہ حیرت زدہ تھی.....اس سے پہلے بائی اماں کا یہ چہرہ اس نے کہاں دیکھا تھا؟

●●

ایک پناہ گاہ سے نکل کر دوسری پناہ گاہ.....

واقعات کتنے رنگ بدلتے ہیں.....

حادثے کتنی کیسی کیسی کروٹیں لیتے ہیں.....

رات کچھ زیادہ ہی سیاہ اور تاریک ہوگئی ہے..... سامنے کی دیوقامت عمارتیں اب خوف کا احساس پیدا کرنے لگی ہیں۔ سچ تو یہ ہے کہ انجو سب کچھ بھول جانا چاہتی ہے.....آخر اس کو اس سڑے گلے سچ کی ضرورت ہی کیا ہے..... جو سوائے چند آنسوؤں کے اسے کچھ بھی نہ دے سکتے ہوں.....

انجو کے گال آنسوؤں سے تر ہو گئے.....

وہ یہ سب کیوں یاد کر رہی ہے..... ماضی سے..... وہ بھی کیڑے لگے ماضی سے دوبارہ اپنا رشتہ کیوں جوڑ رہی ہے ـــــــ جہاں گھنگھروؤں کی جھنکار اور اس کے آنسوؤں کے سوا کچھ بھی تو نہیں ہے.....

مگر نہیں.....وہ سڑی گلی نوابیت کی لاش.....

مردہ قوموں کے نصیب میں سنہرے ماضی کی کہانیاں ہی ہوتی ہیں..... زندہ قومیں اپنے حال پر بھروسہ رکھتی ہیں ـــــــ

لیکن اس قوم نے خود کو زندہ کب سمجھا ہے..... سمجھا ہے ہمیشہ مردہ..... یا ماضی کے پنوں میں ہمیشہ وہی، سڑی گلی نوابیت کی لاش میں، اپنی انا کی تسکین کی ہے.....جھوٹی تسکین.....

''ہم کل کیا تھے'' کی جھوٹی تسلیّاں.....

کل.....جو مرگھٹ میں جلتے مردار کی بو کے سوا کچھ بھی نہیں ہے ـــــــ

وہ پھر وہیں پہنچ گئی، جہاں سے گھنگھروؤں کی صدا پھوٹی تھی اور رانی منڈی میں ہر طرف گوہر بائی کے گھنگھرو بول رہے تھے۔ سازندے ساز بجانے میں مصروف تھے اور بائی اماں اپنے پیروں کو حرکت دینے میں لگی تھیں۔

ڈری ڈری، ہاتھوں میں کتاب لئے، دروازے سے لگی افروز کے لئے یہ منظر کچھ زیادہ نیا تو نہ تھا۔ لیکن وہاں آنے کے لئے ممانعت کی سخ دیوار حائل تھی..... بدی ماما کو بھی سخت تاکید کی گئی تھی کہ افروز کا غلطی سے بھی ادھر کا گزر نہ ہو۔ افروز سہمی ہوئی گوہر بائی کے پیروں کی تھرکن دیکھ رہی تھی کہ اچانک جیسے در و دیوار ہل گئے..... ساز ٹھہر گئے..... بائی اماں نے اس کی طرف دیکھا.....آنکھوں سے غصّے کی چنگاریاں نکلیں۔ اس سے پہلے کہ وہ ننھے ننھے قدموں سے بھاگ پاتی، بائی اماں کا زوردار طمانچہ اس کے گال پر پڑا۔

''یہ کتابیں کس لئے ہیں..... بول..... کیوں آئی یہاں..... کیوں.....میرے اتنے منع کرنے کے باوجود۔ بول.....رنڈی بننا چاہتی ہے میری طرح..... بول کم بخت.....اس لئے پڑھا رہی ہوں تجھے کہ تو بھی رنڈی ہو کر ـــــــ ایک طوائف..... بول..... بول..... بول.....

چٹاخ..... چٹاخ

بائی اماں جیسے پاگل ہو رہی تھیں۔ دوڑے دوڑے بدی ماما نے آکر چھڑایا..... بائی اماں کے دو چار جھانپڑ انہیں بھی پڑ گئے۔

بدی ماما کھونٹے سے بندھے جانور کی طرح ہنہنائے۔

اماں پھٹ پڑیں ـــــــ

''اسے کمرے سے یہاں آنے کو کس نے کہا، بدی میاں.....مشاہرہ مفت کا لیتے ہو جو اس بچی کا خیال بھی نہیں رکھ سکتے ـــــــ جایئے کھڑے کھڑے میرا منہ کیا دیکھ رہے ہیں۔

بائی اماں زور سے دہاڑیں۔ اسے کچھ سمجھ میں نہیں آیا تو وہ زور زور سے رونے لگی ـــــــ

وہ کب اپنے کمرے میں روتے روتے سوگئی، پتہ بھی نہیں چلا۔ نیند تو اس وقت ٹوٹی

جب اس نے خود کو بائی اماں کی بانہوں میں محسوس کیا ـــــ وہ اسے سینے سے لگائے پیار کر رہی تھیں۔ بلائیں لے رہی تھیں۔

''میری بچی..... میرے پیاری بچی.....''

دروازے پر دستک ہوئی

سامنے الطاف حسین کھڑے تھے۔

ننھی افروز نے مڑ کر دیکھا ـــــ الطاف حسین چھڑی کی نوک سے زمین کریدتے، سر جھکائے کھڑے تھے ـــــ

گوہر بائی نے آنکھیں خشک کیں۔ ایک بار پھر اسے سینے سے بھینچا۔ پھر بغیر اسے دیکھے آگے بڑھ گئیں۔

ننھی افروز نے سوچا..... یہ آدمی کون ہے؟

بائی اماں کا کیا لگتا ہے؟

بائی اماں اس کے سامنے کمزور کیوں پڑ جاتی ہیں؟

ننھی سی افروز سوالات کے پیچ وخم میں کیا الجھتی۔ خود ہی ہر ہر قدم ایک سوال بن جاگتی۔ رات کے سناٹے میں جب سارا شہر سو جاتا، وہ چپ چاپ چلتی ہوئی بائی اماں کے کمرے کے پاس آ کر ٹھہر جاتی۔

وہاں کچھ عجیب سی آوازیں ہوتیں.....

سرگوشیاں.....

کبھی کبھی عجیب سا لگتا تو وہ دروازے سے کان لگا کر سننے کی کوشش کرتی۔ جب لوٹتی تو اس کی آنکھوں میں آنسو بھرے ہوتے..... یہ آنسو اچانک کیوں امڈ آتے ہیں، وہ خود بھی نہیں سمجھ پاتی..... لیکن یہ آنسو بھی سوالوں کی گرفت میں ہوتے.....

بائی اماں اس کے پاس کیوں نہیں سوتیں؟

یہ آدمی کون ہے؟

بائی اماں کا کیا لگتا ہے؟

سوال جیسے اس کے ننھے منے وجود سے لپٹ جاتے۔ سوچ کی ہر شاہراہ آنسوؤں سے ہو کر گزرتی۔ لیکن کچھ بھی ہو، یہ آدمی اسے پسند نہیں..... جب اسے پیار کرتا ہے، تب بھی نہیں.....

جانے کیو لگتا ہے جیسے زور زبردستی کر رہا ہو..... جب اسے دیکھ کر مسکراہٹ سجاتا ہے، تب بھی نہیں..... وہ بس اتنا جانتی تھی، اُسے اس آدمی سے نفرت ہے..... لیکن کیوں؟

جب تک وہ ان سوالوں کو سمجھ پاتی، وقت کافی آگے بڑھ چکا تھا۔

وقت آگے بڑھ چکا تھا، اور اس کے حصے میں وہی، نفرت کی، توے پر سینکی گئی روٹیاں چھوڑ گیا تھا ـــــ جو نہ کھانے کی نہ کھلانے کی.....

وہ کچھ بھی تو نہیں بھولی.....

بائی اماں نے ایک بار، جب وہ بہت چھوٹی تھی، پیار سے ٹوکا تھا۔

''مجھے صرف اماں کیوں نہیں کہتی..... آں.....؟ سب بچے تو اماں ہی بولتے ہیں۔ تم بائی اماں کیوں بولتی ہو۔''

وہ اماں کو بس ٹکر ٹکر دیکھ رہی تھی..... کیا کہتی کہ بائی اماں، کبھی کبھی تم بہت عجیب لگتی ہو..... نہیں سمجھ میں آنے والی پہیلی..... آنکھیں کھلتے ہی، ہوش سنبھالتے ہی بس، یہی ایک لفظ تو سنتی آ رہی ہوں..... بائی..... بائی جی..... تمہیں بائی اماں نہ کہوں تو اور کیا کہوں؟

وہی آدمی.....

نواب الطاف حسین..... اس دن اسے گود میں لے کر پیار کر رہے تھے ـــــ

بائی اماں نے جلے کٹے لفظوں میں پھنکارا تھا ـــــ

''سنتے ہیں جی۔ یہ آپ کی لاڈلی بھی ہمیں بائی کہتی ہے۔ بائی اماں۔''

وہ ہنسی تھی ـــــ

''ہوں.....''

نواب صاحب کے چہرے پر ایک لہر آئی ـــــ ایک لہر رخصت ہوئی۔ آہستہ سے اس کی طرف گردن گھمائی۔ بس اتنا بولے.....

''بری بات.....''

ننھی افروز کی آنکھیں حیرت سے گھومیں۔

''آپ سمجھائیے نا۔''

بائی اماں پر پیار کا دورہ پڑا تھا ـــــ ''آخر آپ ہی کی.....''

وہ اچانک رک گئیں.....ٹھہر گئیں.....خوف اور شک کے ملے جلے رنگوں سے اس کی طرف دیکھا۔سر جھکا لیا_____

نواب صاحب نے اتنا کیا_____ کہ اُگالدان منگوایا..... پان کی پیک تھوکی..... بائی اماں کا شانہ سہلایا اور رخصت ہو گئے۔

●●

شلوار اور جمپر پہننے سے لے کر، جسم کے خطوط نمایاں ہو جانے تک وہ بچپن سے اب تک کی تمام ان بجھی پہیلی حل کر چکی تھیں۔ وہ سب کچھ جان چکی تھی..... یہ بھی کہ بائی اماں اسے اپنے پیشے سے الگ ہی رکھنا چاہتی ہیں۔اس لئے ہمیشہ انہوں نے اسے پڑھنے پڑھانے پر زور دیا_____ زندگی سے جڑی چھوٹی چھوٹی باتیں جب اس کی سمجھ میں آنے لگیں تو وہی کیڑا لگا 'ماضی' تھا اور نفرت کے توے پر سینکی گئی روٹیاں.....

وہ کون ہے.....؟

ایک نواب کی ناجائز اولاد.....

جو اپنے اس جرم کے لئے، کسی سے آنکھیں ملانے کی تاب نہیں رکھتا.....

بائی اماں کی.....جن کی کوکھ نہ جانے کتنے مذہب کے جراثیم کھا چکی ہے۔

بائی اماں کی..... بائی اماں میں اسے تھرکتے کولہوں والی ایک طوائف نظر آتی۔اسے نفرت محسوس ہوتی۔

اور وہ اسی نفرت کے احساس کے ساتھ بڑی ہوتی رہی۔

●●

شہناز بائی کی کتاب تو کب کی بند ہو چکی تھی۔

شہناز بائی نے گوہر جان کا بچپن تو دیکھا تھا، لیکن جوانی نہ دیکھ سکیں۔رخصت ہو گئیں۔ اب یہاں گوہر بائی کا راج تھا۔گوہر بائی کا سکّہ چلتا تھا۔یعنی سب کچھ بائی اماں تھیں اور بائی اماں نہیں چاہتی تھیں کہ ان کی طرح اس کے پیروں میں بھی گھنگھروؤں کے جوڑے سج جائیں۔

یہ اس وقت کی بات ہے جب وہاں جاگیرا آیا کرتا تھا۔ بائی اماں کے دلالوں میں جاگیرا کی نہ بدی ماما سے پٹی کھاتی تھی نہ ہی یہ نواب الطاف حسین اسے پھوٹی آنکھ بھاتے تھے۔

افروز کے نوخیز شباب نے ابھی کروٹ ہی لیا تھا کہ جاگیرا کی آنکھوں میں مدہوشی کے ڈورے تیرنے لگے۔

بھری محفل میں اس نے گوہر بائی کا آنچل تھام لیا۔گوہر بائی سن سے رہ گئیں۔وہ دلال تو تھا لیکن تھا بائی اماں کا منہ لگا_____

جاگیرا نے ہنس کر کہا.....

''تمہارا شباب تو اب چند دنوں کا مہمان ہے گوہر بائی..... افروز جان کو بھی اس دھندے سے کیوں نہیں لگا دیتیں.....''

بس اتنا کہنا تھا کہ گوہر جان کے چہرے کا رنگ بدل گیا.....

دفعتاً ایک تیز آواز ہوئی..... چٹاخ.....

محفل کا رنگ بدل گیا.....سازندے اٹھ کھڑے ہوئے۔مجرا بند ہو گیا_____ لوگ سناٹے میں آ گئے.....جاگیرا کی آنکھوں میں خون اُبل آیا_____

جب بدلی ہٹی تو محفل سونی پڑی تھی_____

سامنے تھے صرف، نظر جھکائے ہوئے نواب الطاف حسین.....اور بائی اماں۔

نواب صاحب خوفزدہ تھے۔

''گوہر جان تم نے یہ کیا کیا؟''

برسوں سے نفرت کے لاوے پیتی آئی گوہر جان نے جیسے بارود اُگل دیا_____

''وہی نواب صاحب۔جو آپ کو کرنا چاہئے تھا۔''

نواب صاحب ایک بار پھر سن سے تھے۔

''تمہیں یہ زیب نہیں دیتا گوہر جان.....آخر تم.....''

برسوں سے نواب الطاف حسین خاندانی پن اور قوم کی دہائی دیتے آئے تھے۔اس جملے پر گوہر جان کسی زخمی شیرنی کی طرح دہاڑ اُٹھیں_____

''بڑے مرد بنتے ہو نواب صاحب.....صاف کیوں نہیں کہتے.....کہ گوہر جان۔آخر تم ایک طوائف ہو..... چھنال ہو..... رنڈی ہو..... کیوں نہیں کہتے نواب صاحب.....ارے گوہر جان کے کوٹھے سے تو شہر کا بچہ بچہ واقف ہے.....تم کیسے شریف پوش ہو، جو گھر کی عورتوں سے پردہ

کر کے رات کے وقت چھپتے چھپاتے گوہر جان کے بدنام کوٹھے پر چلے آتے ہو۔''

''گوہر.....ذرا دھیرے بولو۔''

نواب الطاف حسین کانپ گئے ـــــــ

بائی اماں نے آگے بڑھ کر ان کے کرتے کا گریبان تھام لیا ـــــــ

''نواب صاحب..... میں پڑھی لکھی نہیں لیکن اتنا جانتی ہوں کہ جو کام چھپ چھپا کر کیا جائے وہ جرم ہوتا ہے۔ میرے پاس تو لائسنس ہے اور تمہارے پاس؟ جرم تم کرتے ہو..... زمانے سے نظریں چار کرنے کی ہمت ہوتی تو جاگیرے کی طرف سے صفائی نہیں دے رہے ہوتے..... غیرت ہوتی تو ایک باپ کے ناطے بیٹی کے بارے میں غلط لفظ منہ سے نکالنے والے کی زبان کھینچ چکے ہوتے..... لیکن تم بے ہمت بھی ہو ـــــــ اور بے غیرت بھی..... اس لئے میرے سامنے سر جھکائے کھڑے ہو۔''

بائی اماں کے لفظ، لفظ نہیں تھے ـــــــ آسمان سے گرنے والے بڑے بڑے اولے تھے اور دروازے کے دوسرے چھور پر گم سم کھڑی افروز پے در پے گرنے والے ان اولوں کی زد میں تھی۔

یہ خاموشی تو اس وقت ٹوٹی جب اس نے پہلی بار ایک بے زبان جانور کو خوف سے سہمے ہوئے اور بولتے ہوئے پایا تھا۔

یہ بدّی ماما تھے، جو تیزی سے بھاگتے گھر میں داخل ہوئے اور ایک بھیانک چیخ ماری۔

''غضب خدا کا..... فساد ہو گیا۔''

''فساد.....'' نواب صاحب جیسے خواب سے چونکے۔ ہڑبڑا کر جانے کو مڑے ـــــــ

بائی اماں تھوڑی نرم ہوئیں ـــــــ

''اس وقت کہاں جائیں گے آپ..... سنا نہیں۔ بدی کیا خبر لایا ہے۔''

''لے..... کن.....''

نواب صاحب کی آواز میں دم کہاں بچا تھا۔

بائی اماں کی آواز پھر ذرا اونچی ہوئی ـــــــ

''بیوی بچوں کی پڑی ہے آپ کو..... راستے میں خدانخواستہ آپ کو کچھ ہو گیا ـــــــ تو یہ عیش میں جینے والیاں دو دن بھی آپ کا ماتم نہیں کرنے والیں۔ تب بھی یہی گوہر جان ہوگی۔''

گوہر جان نے ایک زوردار ٹھہاکا لگایا۔

وقت کے ساتھ یادیں کتنی دھندلی ہو جاتی ہیں..... اسے یاد ہے..... فساد کا سن کر نواب صاحب کمرے میں بے چینی سے ٹہلنے لگے تھے۔ بائی اماں کے طنز میں ڈوبے تیر لگاتار ان پر حملہ کر رہے تھے..... نواب صاحب کی زبان آخر کب تک چپ رہتی۔ غصّے میں نواب صاحب نے اپنے خاندان کی دہائی دی تھی۔ پھر مسلمانوں کے نصیب کی بات چھیڑ دی تھی۔ ''کہ زمانہ بدل گیا..... وقت ہی بُرا ہے۔ جو کہنا ہے، کہہ لو گوہر جان..... نہ اب وہ نوابیت ہے نہ وہ مسلمان بچے ہیں ـــــــ وہ کیا شاہانہ زندگی گزارا کرتے تھے اور مجال کہ ان کی شان آن بان میں رتی برابر بھی فرق آ جائے۔ مجال کہ کسی کے منہ سے ایک بھی غلط کلمہ نکل جائے۔ سر دھڑ سے قلم ہو جاتے تھے۔''

گوہر جان نے ایک زبردست قہقہہ اُچھالا..... نواب صاحب کے قریب آئیں۔ چہرے کا رنگ بدلا اور لفظوں کے بارود پھر اپنا رنگ دکھانے لگے۔

''تھوڑی بہت تاریخ مجھے بھی آتی ہے نواب صاحب۔ یہ یہ آپ تھے نواب صاحب..... آپ؟ آپ مرد؟ مسلمان؟ ایک بار آپ نے طوائف کہہ کر مجھے گالی دی تھی۔ اس وقت میں مصلحتاً خاموش رہی تھی، آج آپ نے دبی زبان میں وہی گالی دوبارہ دہرائی ہے..... میں طوائف ہوں، اس لئے آپ کی گالی، مجھے گالی نہیں لگی نواب صاحب۔ لیکن پوچھتی ہوں آپ سے۔ آپ کیا ہیں؟ کل سے آج تک صرف بربادی کی داستان لے کر آئے ہیں آپ..... مسلمانوں کے شاندار ماضی میں آپ کو صرف ان کے گھنونے جرموں کی کہانیاں ہی یاد ہیں۔ جرم کے قصّے یاد ہیں..... عیش و عشرت کے افسانے یاد ہیں اور آپ..... آپ کتنے پانی میں ہیں نواب صاحب۔ مسلمانوں کی دہائیاں دیتے ہیں نا آپ، قوم کا درد جاگتا ہے نا آپ کے سینے میں..... تو مجھ سے سنئے۔ ہاں ایک طوائف سے سنئے۔ آپ سب طوائف سے بھی گرے ہوئے لوگ ہو۔ آپ نے صرف عیاشیاں کی ہیں اور سینکڑوں برسوں کی حکومت خاک میں ملا دی۔ جاگیریں لٹوا دیں۔ ملک کے ٹکڑے ٹکڑے کروا دیے اور اب، دنگے کروا رہے ہیں آپ.....''

گوہر جان پر جیسے پاگل پن کا دورہ پڑ گیا تھا۔

نواب صاحب یکا یک زور سے چیخے۔

''تم ہوش میں تو ہو گوہر جان۔ یہ کیا بکے جا رہی ہو۔''

گوہر جان جیسے اچانک ہوش میں آ گئیں ـــــ ہاں، سچ مچ وہ یہ ہزیان میں کیا کیا بولے جا رہی تھیں۔ بدی تو فساد کی خبر لے کر آئے تھے..... نواب صاحب آہستہ آہستہ چھڑی گھما رہے تھے..... بدی ماما نے یکا یک آگے بڑھ کر اسے پکڑ لیا ـــــ

''ولی گنج تحصیل کے پاس ایک خالی بیکار زمین کو لے کر دو فرقوں میں تصادم ہو گیا..... شہر میں دھارا 144 ہے۔''

''کیا؟'' گوہر جان نے خوفزدہ ہو کر بدی ماما کو گھورا۔

نواب صاحب ایک بار پھر سر جھکائے چھڑی کی نوک سے زمین کریدنے لگے تھے ـــــ ماحول میں سناٹا چھا گیا تھا۔

(5)

گوہر بائی کو اچانک احساس ہوا۔ نواب صاحب سے انہوں نے یہ کیا کہہ دیا ـــــ ''دنگوں کے ذمہ دار بھی آپ ہیں۔'' پتہ نہیں نواب صاحب نے کیا محسوس کیا ہو..... لیکن..... اس کی غلطی بھی کیا تھی۔ جو سنا وہی تو کہا۔ کوٹھے پر کیسے کیسے لوگ آیا کرتے ہیں۔ وہ بھی تو دوسرے گاہکوں کی طرح ہی ایک گاہک تھا..... جس نے اس سے عجیب عجیب باتیں کی تھیں..... کتنی باتیں..... کیسی کیسی باتیں.....

اسے کبھی کبھی لگتا..... وہ صرف ایک طوائف ہے..... شاید اسے یہ سب نہیں سوچنا چاہئے..... یہ باتیں، ملک کے سیاست دانوں کے لئے چھوڑ دینا چاہئے۔ آخر اب کچھ نیا کیا رہ گیا ہے..... کل چوری ہوتی تھی، ڈاکے پڑتے تھے، قتل ہوتے تھے تو کچھ دیر کے لئے کلیجہ بھر آتا تھا۔ لیکن اب..... کیسے کیسے قصّے اور کیسی کیسی باتیں سنتی ہے وہ ـــــ اور اس کے یہاں آنے والے ڈراؤنے خواب کی طرح کیسے کیسے بھیانک واقعات لے کر بیٹھ جاتے ہیں۔

''توبہ..... توبہ.....'' گوہر جان نے ذہن بٹانے کی کوشش کی تو پھر آنکھوں کے سامنے وہی گاہک دوڑ گئے جو قصّوں کی پٹاری لے کر بیٹھ جایا کرتے..... کچھ لوگ تو بس آنے کے ساتھ ہی شروع ہو جاتے..... ادھر کی ادھر کی..... کچھ گھر کی..... اور کچھ، بے رحم وقت کی بے بسی کا نوحہ گا رہے ہوتے۔ کچھ تو بے حد اذیت پسند ہوتے..... کچھ میٹھی میٹھی باتیں کر کے لطف حاصل کرتے اور کچھ اپنی محبت کی کہانیوں کو لے کر شروع ہو جایا کرتے..... ادھر آنے والوں میں، جب سے ملک نے سیاست کا زہریلا دھواں پینا شروع کیا، کچھ نیتا جیسے لوگ بھی آتے تھے اور جنہیں ملک کی فکر کھائے جاتی تھی۔

تقسیم کے بعد تیزی سے بدلتی حکومتیں ـــــ سیاسی حکمرانوں نے مذہب کو اپنا آلہ کار بنایا تھا۔ گوہر بائی کے پاس مولوی، پنڈت جیسے لوگ بھی آیا کرتے، جو اپنی ڈفلی اپنا راگ الاپا کرتے..... جیسے گوہر بائی کو شہناز بائی سے اپنی اماں کی بدنصیبی کی کہانی تو معلوم ہوئی لیکن پاکستان بن جانے کے بعد یہاں کے مسلمانوں پر کیا کیا افتاد پڑی، اس کا ذکر تو وہ یہاں آنے والے زیادہ تر لوگوں سے ہی سنتی رہی۔ جان و مال کا کیسا نقصان ہوا، وہ تو یہاں آنے والے دردمندوں سے ہی معلوم ہوا کہ جو مال والے تھے پاکستان جا کر کنگال ہو گئے ـــــ جو کنگال تھے مالا مال ہو گئے۔ بس مکان کا تالا توڑنا تھا..... اپنا قبضہ جمانا تھا..... اسلام تو وہاں نام کا ہے گوہر بائی۔ فیشن میں تو پاکستان نے ہندوستان کی بھی چھٹی کر رکھی ہے۔

کوٹھے پر آئے ہوئے ایک ملاّ نما شخص نے بتایا تھا..... ''مسلمان یہاں محفوظ کہاں ہیں گوہر بائی؟ اللہ میاں کا عذاب ہے..... پہلے شہنشاہیت چھنی..... پھر دوسروں کا محتاج بنا دیا..... کافروں کو حاکم بنا دیا..... مسلمانوں کو ماتحت..... گوہر بائی کو سب کچھ یاد ہے ـــــ وہ اس کی جلی کٹی باتیں نہیں بھولیں۔ وہ آنکھوں میں سرمہ لگائے تھا ـــــ گند چہرے سے بدمعاش لگتا تھا..... لیکن آواز میں عجب سا جادو تھا۔ پتہ نہیں اس رات وہ کیا کیا بولتا رہا۔ لیکن وہ آوازیں جیسے اب بھی کانوں میں گونج رہی ہیں۔

''سب کو عیاشیاں لے ڈوبیں گوہر بائی ـــــ تاج و تخت چھن گئے۔ مال و متاع سے محروم کر دیئے گئے ہم۔ برق گرتی ہے تو بے چارے مسلمانوں پر..... آج ساری دنیا میں ذلیل و خوار ہو رہے ہیں..... اور یہاں اپنے ملک میں..... جہاں ہمارے مکان ہیں..... اپنی تجارت ہے، یہاں بھی ہماری تجارتیں چھین لینے کے حربے آزمائے جا رہے ہیں۔ آگ لگائی جا رہی ہے ـــــ مسلمانوں کو بڑے بڑے عہدے اور محکمے نہیں دیئے جا رہے ہیں۔ فساد اور دنگے کرا کر ان کی آبادی کم کی جا رہی ہے۔ کہیں کوئی بھی مسلمانوں کے حق میں نہیں ہے۔ سب اوپر سے کچھ کہتے ہیں، اندر سے کچھ ہیں..... اور وہ قائداعظم..... مولوی کے گلے سے زہر کی لپٹیں نکلی تھیں..... پاکستان بنا کر اچھا نہیں کیا جناح نے..... اچھا نہیں کیا۔ کمزور کر دیا ہمیں.....''

اور گوہر بائی پھٹی پھٹی آنکھوں سے مولوی کو تکتی رہی..... یہ کیا ہے..... کیسا زہر ہے..... اسے تو بچپن سے ناچنے اور گانے کی تعلیم ملی تھی۔ ان باتوں کو بھلا وہ کیسے سمجھ پاتی۔

●●

اور بھی کتنے چہرے تھے.....

کیسے عجیب عجیب چہرے.....

ایک چہرہ اس دبلے پتلے مریل سے شخص کا تھا..... پاؤں سے بھی کمزور تھا 'جنا'..... چہرے پر چیچک کا داغ۔ ماتھے پر بڑا سا ٹیکہ..... وہ شاید کسی مذہبی پارٹی کا لیڈر تھا۔ وہ اپنے دبلے پتلے ٹیڑھے میڑھے ہاتھوں کو ماسٹر جی کی بینت کی طرح غصّے میں ہلاتا ہوا کہہ رہا تھا۔

''تم تو مسلمان ہو گوہر بائی.....'' وہ مسکرایا۔ ''مگر تم مسلمان کہاں ہو..... تم لوگوں کا بھی دین ایمان ہونے لگا تو پھر ہمارے جیسے لوگ جائیں گے کہاں..... لیکن ایک بات ہے گوہر بائی..... ذرا سوچو..... دل پر ہاتھ رکھ کر خود ہی فیصلہ کرو..... مسلمانوں نے جب لڑ جھگڑ کر اپنا الگ پاکستان لے لیا تو.....؟ یہاں رہنے سے فائدہ؟ کیوں ٹھیک کہہ رہا ہوں نا میں.....؟ رہنا ہے تو ٹھیک سے رہیں..... ورنہ اٹھائیں سامان اور جائیں پاکستان۔ غصّہ مت ہو گوہر بائی۔ ذرا سوچو..... مسلمانوں کے ملک تو انیک ہیں، ہندوؤں کے ملک ہی کتنے ہیں؟ آپ نے تو ہندوستان میں سے بھی ایک پاکستان اچک لیا اور پاکستان کے ماتھے پر اسلام لکھ دیا۔ اب ہندوستان کے ماتھے پر ہندو راجیہ لکھا جائے گا تو کون سی آفت آ جائے گی۔ کیوں، غلط کہا میں نے گوہر بائی۔ اب سچ سچ بتانا۔ سارا قصور تو تمہارے مسلمانوں کا ہے۔ وبھاجن کے ذمہ دار بھی وہی..... یہاں ہونے والے دنگوں کے بھی۔ غدار کہیں کے..... میرا بس چلے تو..... لیکن تم کیوں لال پیلی ہو رہی ہو گوہر بائی؟''

اور.....

گوہر بائی اچانک گہرے سناٹے میں آ گئیں۔

اس حقیقت سے تو کبھی ان کا تعارف ہی نہیں ہوا تھا۔

یہ کیسی داستان ہے؟

لہجوں میں یہ کیسا زہر بھر گیا ہے.....

وہ مولوی اور یہ پنڈت.....

اسے تو اپنی ماں اور عزیز النساء کی درد بھری داستان معلوم تھی، جو پاکستان جانے والے

قافلے سے بچھڑ کر ایک بدمعاش، ہندو ویرا کے ہاتھوں پڑ گئی تھی جو انہیں اٹھا کر کوٹھے پر لے آیا تھا۔ بس اتنا ہی جانتی تھی وہ۔ انہیں نفرت تھی ہندوؤں سے۔ لیکن یہ مرچی جیسا دکھنے والا شخص کیا ہذیان بک رہا ہے۔ مسلمانوں نے بھی لوٹا ـــــ گھر جلائے ـــــ آبروریزی کی؟

●●

تاریخ کے کتنے چہرے ہوتے ہیں.....؟

سچ کے کتنے پہلو ہوتے ہیں.....؟

فساد.....سیاست.....کوٹھا.....

اس نے پھر ٹھمکا لگایا۔ مجرے کے بول گنگنائے، سازندوں کے ساز پر رقص کیا اور الطاف حسین کو کھری کھوٹی سنا دیا کہ تم.....

دنگوں کے اصل ذمہ دار تو تم ہو.....

تم ہو.....

برسوں سے اندر دبی آگ کا استعمال وہ اور کہاں کرتی ـــــ

یہ اس کے مذہب والے.....اسے نفرت ہے۔ سب سے نفرت ہے.....سب کے سب گندے ہو گئے ہیں ـــــ ماں کے جنے.....عیاش.....

اور یہ الطاف حسین..... وہ تو دنیا کی ساری گندی گالیوں کا اکیلا مستحق ہے.....صرف تسلی کے بول دیئے جا رہا ہے..... بدمعاش.....

اسے لگا، اس کی تسکین ہو گئی ہے۔ آخر نواب صاحب کی اپنی بھی تو اولاد ہیں۔ افروز کے سر پر ایک دن بھی تو شفقت سے ہاتھ نہیں پھیرا۔

دوسروں کی طرح وہ بھی تو.....صرف ایک گاہک ہیں.....بس.....

●●

دھند چھٹی.....اور گوہر بائی اس دھند سے باہر نکل آئیں۔

افروز کمرے میں آئی تو اس نے پوچھا۔

''آج ٹیچر نہیں آئے؟''

''ان کی طبیعت خراب ہے۔ آج وہ نہیں آئیں گے۔''

افروز جانے کو ہوئی تو اس نے ٹوکا۔ ''کیا بات ہے افروز.....نہ تم ہنستی ہو، نہ کبھی خوش ہوتی ہو..... یہ ہر وقت مرجھایا ہوا چہرہ.....میری بچی، تیری طبیعت تو ٹھیک ہے؟

''بائی اماں..... ماسٹر جی شاید ابھی ایک دو روز اور نہیں آئیں.....ان کا مکان فساد زدہ علاقے میں پڑتا ہے۔''

افروز نے دوسری طرف منہ پھیر لیا۔

بائی اماں کی، جیسے کسی نے دکھتی رگ پکڑ لی ہو.....''ہائے اللہ..... یہ بچی تو اپنی ماں کو دیکھ کر مسکراتی بھی نہیں اب.....کتنی بڑی ہو گئی ہے.....اور.....دو۔''

گوہر بائی نے جیسے خود پر نظر ڈالی..... پھر مطمئن ہو گئیں.....'نہیں.....ابھی ان کے ڈھلنے میں کافی دن باقی ہیں.....'

وہ بچوں کی طرح خوش ہو گئیں۔

افروز کمرے میں ایک قطار سے رکھے ہوئے ساز دیکھ رہی تھی جو ابھی خاموش تھے ـــــ سازندوں کی انگلیوں اور گاہکوں کے انتظار میں تھے۔

ایک نامعلوم خطرے کا احساس کرتی ہوئی گوہر بائی افروز جان کو بغور دیکھے جا رہی تھی۔

تب، ملک کی سیاست میں ایک نئے خونی باب کو جوڑنے کی تیاری چل رہی تھی ـــــ

(6)

ادھر گوہر بائی کا شباب ڈھلنے پر آیا، ادھر نومنس لینڈ (No Man's Land) پر منٹو کے ٹوبہ ٹیک سنگھ کی لاش پڑی تھی۔

ملک کے حاشیے پر اس وقت سب سے بڑا ہیرو مذہب تھا اور یہ نازک سا کھلونا بطور ہتھیار سب کے پاس تھا۔ ہر شخص اس سے کھیلتا تھا یا کھیل سکتا تھا ـــــ خواہ وہ سیاستداں ہو یا عام آدمی۔ نہیں۔ وقت بدلا تھا۔ ملک کی تہذیب بدلی تھی۔ زمانے کا چلن بدلا تھا۔ مذہب کے رنگ بدلے تھے۔ جنون کے انداز بدلے تھے۔ فکر کا تیور بدلا تھا۔

اور.....

برسوں سے چلی آ رہی محبت بدلی تھی ـــــ

افروز اب ننھی بچی نہیں رہ گئی تھی۔ وہ سب کچھ سمجھ رہی تھی، وقت کو، انسان کو، اپنے یہاں آنے والوں کو..... وہ دیکھ رہی تھی، سمجھ رہی تھی..... اور سوچ رہی تھی..... جذبات اور احساس سے یہ لوگ اس قدر کٹتے کیوں جا رہے ہیں ـــــ انسان مشین کیوں بنتا جا رہا ہے۔ سڑکوں پر پھیلے لہو کو دیکھ کر بھی کوئی چنگاری اندر پیدا کیوں نہیں ہوتی.....؟

بائی اماں اب موقع نکال کر نیاز فاتحہ بھی کرنے لگی تھیں۔ محفل مولود کے لئے بدی ماما چند مولویوں کو پکڑ لاتے ـــــ اماں وعظ بھی سنتیں ـــــ بریانی بھی کھلاتیں اور پیسے دیتیں۔ کبھی کبھی قرآن پاک کی تلاوت بھی کر لیتیں۔ وقت ملتا تو نہا دھو کر نماز بھی پڑھ لیتیں۔ بائی اماں کی خواہشوں کی کوئی حد نہیں تھی ـــــ جیسے ان کی بیٹی سارے زمانے میں عزت پاتی..... وہ اچھا لڑکا دیکھ کر ہاتھ پیلے کر دیتیں ـــــ جو خوشی ان کے نصیب میں نہیں آئی، وہ افروز پوری کرتی..... پھر

ایک خوبصورت سی پھلواری ہوتی..... اور وہ پرانے بدرنگ دنوں کو ایک دم سے بھول جاتیں۔

لیکن خوابوں کا کیا.....

اندر دھنشی رنگوں کا کیا؟

بائی اماں..... جیسے آسمان دیکھتے دیکھتے، کوئی ٹوٹا تارا ان کی آنکھوں میں چبھ جاتا.....

''سب سے خطرناک ہوتا ہے ہمارے سپنوں کا مر جانا۔''

کتنی مشکل سے پڑھ پائی ہے افروز..... کیسی کیسی دستوں کا سامنا کیا۔ کتنی دقتیں جھیلی ہیں ـــــ نواب صاحب کی کتنی کتنی منتیں کی ہیں..... یہ سب وہی جانتی ہیں۔

لیکن افروز کا مستقبل کیا ہوگا ـــــ؟

کیسا ہوگا ـــــ؟

اس سوال کے جواب میں وہ درخت سے ٹوٹے ہوئے پتے کی طرح کانپ جاتیں..... لاکھ کوشش کے باوجود بھی وہ اسے کوٹھے سے دور رکھنے کی تدبیر نہ کر سکیں۔

(7)

شہر کی فضا پھر خراب ہوگئی تھی۔ یوں تو رانی منڈی میں اچھے کہے جانے والے مکان تو کم ہی تھے۔ یہ پورا علاقہ ہی رنڈیوں کا تھا ـــــ لیکن یہاں مسلم طوائفوں کی تعداد زیادہ تھی۔ ان میں زیادہ تر بنگلہ دیش سے بھاگی یا بھگائی ہوئی لڑکیاں تھیں ـــــ جنہیں کم داموں کے عوض رانی منڈی میں بیٹھا دیا گیا تھا۔ فساد یا ہنگامے کا اس محلے پر بھی کوئی اثر پڑتا، یہ سوچنا ہی فضول تھا۔ آزادی کے بعد دنگے تو جیسے اس ملک کی تقدیر بن گئے تھے۔ بائی اماں کو اپنے اس تاجر گاہک کی بات اب تک یاد تھی۔

''دیکھ لینا یہاں بھی جم کر فساد ہوگا۔ یہاں مسلمانوں کی آبادی اچھی خاصی ہے۔ مسلمان خوشحال ہیں، تجارت میں بھی آگے ہیں۔ آر ایس ایس اور وشو ہندو پریشد جیسی جماعتوں کی آنکھیں تو بس ایسے ہی شہروں پر ٹکی رہتی ہیں۔ دنگے کروادو..... مسلمانوں کو غریب اور بے روزگار بنادو۔ معاشی طور پر انہیں اتنا کمزور کردو کہ وہ سر ہی نہ اٹھا سکیں۔''

بائی اماں کو ہندوؤں سے نفرت محسوس ہوئی۔ کتنے برے ہیں یہ ـــــ مسلمانوں کے لئے بھائی جیسا لفظ ان کے ذہن میں کوندا تھا۔ تبھی تو اتنی مارکاٹ مچتی ہے۔ چاروں طرف مسلمان مارے جاتے ہیں۔ بائی اماں کو، شہر کی فضا کو لے کر مسلمانوں کی طرف سے بہت فکر تھی۔ کئی دنوں سے وہ سن رہی تھیں کہ کوئی مذہبی جلوس نکلنے والا ہے..... پتہ نہیں کیا ہوگا۔ ایک دہشت سی اندر بیٹھ گئی تھی۔

جلوس نکلا۔ تھوڑی بہت افراتفری کے بعد معاملہ دب بھی گیا ـــــ لیکن شہر کی فضا بجائے ٹھیک ہونے کے اور بھی خراب ہوگئی ـــــ دو ایک روز سے بدی ماما روز ہی کوئی نہ کوئی بری خبر لے کر حاضر ہو جاتے۔

ـــــ قصاب ٹولہ کے رحمتو نے ایک ہندو کو چاقو مار دیا۔ پانچ پیر کے مزار کو لے کر دو فرقوں میں ٹھن گئی۔

ـــــ ہندوؤں کے مذہبی جلوس پر مسلمانوں نے پتھراؤ کیا۔

ـــــ جامع مسجد میں جمعہ کی نماز پڑھتے مسلمانوں پر کسی ہندو نے گوشت کی ہڈی پھینک دی۔

ـــــ ابراہیم کی مسجد میں بم بنائے جا رہے ہیں۔

ـــــ مسلمانوں نے بھی ایک جلوس نکالنے کا فیصلہ کیا ہے۔

●●

کتنی ہی خبریں..... خون لپلپاتی خبریں..... اس دن اجمیری آئی تھی..... بنگلہ دیش میں اس کا سارا خاندان تباہ ہوگیا۔ اجمیری کی آنکھوں میں دہشتوں کا جنگل آباد تھا۔

''گوہر بائی..... کیا یہاں بھی؟''

''یہاں کچھ نہیں ہوگا..... کوٹھوں کا مذہب سے کوئی تعلق نہیں ہوتا۔''

بائی اماں نے اطمینان سے تسلی دی ـــــ مگر اجمیری کی آنکھوں سے دہشت نہیں ختم کر سکی۔ مجرے میں تو سب آتے ہیں، طرح طرح کے لوگ..... مگر کسی کی آنکھیں بھی نفرت سے لہولہان نہیں لگتیں۔ پھر اتنے سارے گدھ کہاں سے آجاتے ہیں ـــــ؟

بائی اماں سوچتی رہتی تھی ـــــ انہیں اپنی فکر نہیں تھی۔ فکر تھی..... بس افروز کی..... اس کا اپنا جسم تو کوٹھے کی زینت بن ہی گیا۔ دنگے فساد میں لڑکیوں کی آبروریزی بھی تو ہوتی ہے۔ اجمیری بھی تو پہلے ایسی نہیں تھی۔ آبرو لٹنے کے بعد ہی تو اس نے اس پیشے سے سمجھوتا کیا۔ کبھی جی چاہتا، افروز کو لے کر وہ کہیں دور نکل جائیں۔ مگر کہاں؟

کون سی جگہ.....؟

جہاں پر وحشتیں اپنا ڈیرہ نہ ڈالے ہوں.....

جہاں مسلمان محفوظ ہوں.....

ایسی کوئی جگہ بائی اماں کو نظر نہیں آ رہی تھی.....اس مسئلے کو لے کر بائی اماں پڑوس کی لگ بھگ سبھی طوائفوں سے مل آئیں۔ دلشاد بائی، امیر بائی، کوثر جان، دلربا بائی.....

اسے حیرت ہوئی۔ سب نے اس کا مذاق اڑایا——

''یہ کوٹھا ہے.....کوٹھا.....گوہر جان..... یہاں کچھ نہیں ہوگا۔''

لیکن..... نیاز..... فاتحہ، مقبروں پر جانا، بڑے پیر صاحب حضرت عبدالقادر جیلانی کا نیاز.....خواجہ بابا کا نیاز.....مولود شریف.....

طوائفوں کا عقیدہ تو بہت مضبوط ہوتا ہے—— پھر اگر مذہب کے نام پر تباہی مچتی ہے تو بجلیاں ان پر بھی تو گر سکتی ہیں——

گوہر بائی کو اپنی اماں کی یاد آئی ہے جو اسے پیدا کرتے ہی چل بسی تھیں.....شہناز بائی نے اسے سب کچھ بتایا تھا..... پروردگار.....ساری آزمائشیں مسلمانوں کے لئے.....اماں کو کیسی کیسی مصیبتیں جھیلنی پڑیں۔ مہاجر ہونے کا دکھ اٹھانا پڑا اور کیا ملا.....ایک کوٹھا.....ایک بدنصیب کوٹھا.....جو ہمیشہ کے لئے گوہر جان کا مقدر بن گیا۔

مکمل عورت کا تصور کہیں اندر ہی گم ہو گیا تھا۔ سو گیا یا مردہ ہو گیا.....لیکن وہ یہ قصّہ افروز کے ساتھ نہیں ہونے دیں گی۔

●●

اس دن دوپہر کا وقت تھا۔ ایک 'السائی' ہوئی دوپہر.....گوہر جان کا انگ انگ ٹوٹ رہا تھا—— بدی ماما کو دھونے دینے کے لئے وہ پرانے کپڑے کی گٹھر باندھ رہی تھیں کہ دیکھا—— دروازے کے دونوں پلے دھڑ سے کھلے—— چہرے پر وحشت کی داستان لئے، رنگین جانگھیا اور بے ڈھنگا سا کرتا پہنے بدی ماما پریشان سا اندر آ گیا.....

وہ چونک پڑی.....

''کیا بات ہے؟''

''وہ.....دنگا.....!''

ہانپتے ہوئے بدی ماما دھم سے بستر پر گرے.....گھوڑے کی طرح ان کا منہ خوف سے

ہنہنایا.....منہ سے بھینچی بھینچی آواز نکلی.....وہ خوف سے تھر تھر کانپ رہے تھے۔

''بدّی.....!''

گوہر جان اتنی تیزی سے چیخیں کہ دوسرے کمرے سے بھاگ کر افروز دوڑی دوڑی آئی۔

پھر اس نے ایک عجیب سا منظر دیکھا۔

بدی کا سر—— اماں کے زانو پر تھا—— منہ سے جھاگ باہر آ رہی تھی.....گھوڑے کی طرح ان کے پاؤں ایسے ہل رہے تھے جیسے اچانک چابک مارا گیا ہو——

''وہ.....مار.....ڈالیں گے.....مار ڈالیں گے.....''

''یہ کیا تماشہ ہے.....''

''وہ مار.....ڈالیں.....''

گھوڑا مسلسل ہنہنا رہا تھا.....

''ہوش میں آؤ بدی.....''

''بنگلہ دیش..... بنگلہ دیش.....''

''ہاں، جانتی ہوں—— بنگلہ دیش میں بھی یہی ہوا تھا..... یہاں کچھ نہیں ہوگا۔''

''وہ چھوڑیں گے نہیں..... مار.....ڈالیں گے.....میری بیٹی.....''

●●

افروز اپنی جگہ جیسے تھم سی گئی۔ 'میری بیٹی'.....گھوڑے کے اس آخری لفظ نے اس کے اندر بھی تھر تھراہٹ بھر دی.....وہ غور سے آٹھویں عجوبے جیسے اس منظر کو دیکھ رہی تھی۔

بدی ماما پاگلوں جیسی حرکتیں کر رہے تھے——

''میری بیٹی.....وہ.....مار ڈالیں گے.....''

ان کی آنکھ آنسوؤں سے تر تھی——

''میری بیٹی.....میری زرینہ.....!'' بائی اماں نے آنکھوں سے دروازہ بند کرنے کا اشارہ کیا۔ پھر چیخیں.....

''افروز مالش کا تیل لے آؤ۔''

وہ دوڑ کر تیل کی شیشی لے آئی..... اماں ہتھیلیوں کو تیل سے بھر کر ان کا سر دبا رہی تھیں۔ بدی ماما کے پتلے، سوکھے پیر چارپائی سے باہر زمین پر لٹکے تھے..... وہ سچ مچ کسی مریل گھوڑے جیسے دکھائے دے رہے تھے..... اماں کے ہاتھ تیزی سے ان کے سر پر دوڑ رہے تھے..... وہ حیرت سے دروازے کا سہارا لئے دیکھ رہی تھی ـــــ اماں بار بار تر ہو جاتی آنکھوں کو پلّو سے پونچھ رہی تھیں۔

●●

کمرے میں گہرا سناٹا ہے۔

الگنی پر ادھر ادھر کپڑے بکھرے ہیں.....

'یہ سب.....'

افروز کی آنکھوں میں شک کی پرچھائیاں ہیں.....

''بائی اماں۔ یہ سب کیا تھا؟''

پھر جیسے گہرے کنویں سے بائی اماں کی آواز ابھری ـــــ

''بدّی کو ہنگامے سے ہول آتا ہے..... بے چارہ..... پرانے زخم تازہ ہو جاتے ہیں..... بنگلہ دیش میں اچھا خاصا خاندان تھا اس کا..... سبزی منڈی میں سبزیوں کے ٹھیلے لگاتا تھا۔ زرینہ تھی اور ایک بیٹا بھی تھا۔ شیخ مجیب کے وقت میں جب وہاں آندولن چھڑا، تو بھاری مار کاٹ مچ گئی۔ آنکھوں کے سامنے اس نے اپنے گھر خاندان والوں کو تکا بوٹیوں کی طرح کٹتے دیکھا ہے ـــــ وہاں سے بچ بچا کر یہاں رانی منڈی میں پہنچ گیا ـــــ نہ جیب میں کچھ..... نہ کھانے کو کچھ..... بن پان والے نے اسے میرے پاس بھیج دیا..... تب سے میرے یہاں ہے۔''

بائی اماں بولتے بولتے ٹھہر گئیں..... افروز نے بھی چونک کر دیکھا۔ دروازے پر سوجی ہوئی آنکھیں لئے بدی کھڑا تھا ـــــ

''کپڑے دھو لئے؟''

''ہاں.....!''

''جاؤ اب آرام کرو۔''

اماں نے اشارہ کیا۔ بدی تھوڑا سا گھوڑے کی طرح ہنہنایا، پھر آگے بڑھ گیا ـــــ

(8)

مجرا شروع ہونے میں ابھی دیر تھی..... لوگ آنے لگے تھے۔ وقت گزاری کے لئے سازندوں نے ریہرسل شروع کر دی تھی۔ بدّی پان کے طشت سجا رہا تھا ـــــ اچانک دھڑ دھڑاتے ہوئے دروازے کے دونوں پٹ کھول کر جاگیرا اندر آ گیا ـــــ

''گوہر جان کہاں ہے؟''

سازندوں نے اشارہ کیا۔

گوہر جان اس وقت تک لباس تبدیل کر چکی تھیں۔ افروز بڑی ہو رہی تھی اور گوہر جان ـــــ وہ شباب کی آخری منزل پر تھی۔ آئینے کے سامنے اپنے نقش و نگار کا جائزہ لیا تو سکون ملا..... ابھی دم باقی ہے..... ابھی ان کی محفلیں سونی نہیں ہوں گی۔ سونی ہونی شروع ہوگی تو وہ کوئی اور گوہر جان خرید لے گی۔ وہ چاہتی تو دوسری طوائفوں کی طرح دلالوں سے کہہ کر سستی قیمتوں پر لڑکیاں منگوا لیتی۔ مگر فی الحال افروز کی وجہ سے اسے یہ منظور نہ تھا۔ یوں بھی اس کا دھندا ابھی مندا نہیں ہوا تھا۔ رونق باقی تھی۔

تیر کی طرح اچانک گھس آیا جاگیرا ـــــ

گوہر بیگم نے مسکرا کر دیکھا۔ ''کیوں اتنے دن کہاں لگا دیئے؟''

وہ پرانی باتوں کو بھول جانا چاہتی تھیں ـــــ

جاگیرے نے جیب سے ایک ہزار روپے کا بنڈل نکال کر گوہر بیگم کے سامنے پٹک دیا۔

''یہ..... کسی بینک میں ڈاکہ ڈالا ہے کیا؟''

''نہیں۔''

''چوری کی ہے؟''

''نہیں۔''

''دھندے میں کمایا ہے؟''

''ہاں.....امیر بائی کو ایک سونے کی مرغی بیچی ہے۔'' جاگیرا ہنسا_____

''لیکن اسے میرے پاس کیوں لایا ہے؟''

''تیرے لئے ہی سمجھ گوہر جان۔ یہ افروز جان کی نتھ اترائی کی قیمت ہے۔''

گوہر جان کا پورا جسم غصّے سے، آتش فشاں کی طرح سلگ اٹھا_____ غصّے میں ہاتھ اٹھایا تو جاگیرا نے ہاتھ تھام لیا.....

''بس بہت ہو چکا گوہر جان.....اب مجھے پتہ چلا کہ دوسری طوائفوں کی طرح قیمت دے کر تم لڑکیاں کیوں نہیں منگواتی_____ افروز جان کی پڑھائی کی وجہ کیا ہے_____؟ اب پتہ چلا گوہر جان_____ تم اسے کلبوں میں بھیجو گی_____ بڑے بڑے ہوٹلوں میں لے جاؤ گی اور افروز جان کسی پوش ایریا میں تمہارے لئے قیمتی رہائش کھڑی کر دے گی_____ جہاں تم عزت دار ہونے کا ڈھونگ کرو گی_____ اور وہ کال گرل بڑے بڑے گھرانوں کے لڑکوں سے پیسے اینٹھتی رہے گی_____ مجھے سب پتہ چل گیا ہے گوہر جان، سب معلوم ہو گیا ہے۔''

●●

گوہر جان کا پورا چہرہ جیسے بارود بن گیا ہو۔ آگ کی دہکتی ہوئی بھٹی..... بے رحمی سے جاگیرا نے گوہر جان کے ہاتھ کو دبایا، پھر چھوڑ دیا۔ تیز آواز سن کر سازندے دروازے تک آ کر ٹھٹک گئے_____ اندر آنے کی ہمت نہیں ہوئی_____

''سودا کرتی ہے یا؟''

''جاگیرا.....'' گوہر جان کی چیخ گونجی۔

جاگیرا نے ایک ذلیل سا قہقہہ لگایا_____

''سودا.....''

''رفیع میاں.....احمد بھائی.....جلدی دوڑئے۔''

گوہر جان نے بے بسی سے سازندوں کو آواز دی۔ آس پاس کی کھڑکیاں کھل گئیں۔ بھیڑ جمع ہو گئی۔ جاگیرا چیخ رہا تھا۔ سازندے اسے کھینچ رہے تھے۔

گوہر جان پھٹی پھٹی آنکھوں سے اس دروازے کی طرف دیکھ رہی تھیں، جہاں سے سازندے ابھی ابھی جاگیرا کو کھینچ کر لے گئے تھے۔ گوہر جان بستر پر دھم سے لگ بھگ گر گئیں۔

آنکھوں کے آگے گہرا اندھیرا چھا گیا_____

●●

رانی منڈی کے لئے یہ واقعات کچھ نئے نہیں تھے۔ روزانہ یہاں ایسے واقعات ہوتے ہی رہتے ہیں۔ لیکن افروز کو کون سمجھائے۔ جاگیرا کے لفظ، لفظ نہیں تھے_____ پگھلا ہوا سیسہ تھے جو اچانک کسی نے اس کے کان میں انڈیل دیا ہو..... پورے جسم پر پھپھولے پڑ گئے تھے_____ جیسے کسی نے گلابی جسم پر تیزاب پھینک دیا ہو_____ ایک عجیب سی آگ تھی۔ پورا جسم جل رہا تھا.....دماغ بھی.....ذہن بھی.....وہ چیخ چیخ کر رونا چاہتی تھی۔ پاگلوں کی طرح.....

یہ سب..... یہ سب کیا ہے۔ وہ کوئی نمائشی گڑیا ہے۔ یہ ماحول..... یہاں آنے والے.....اس کی بائی اماں.....کبھی کبھی ایک ابکائی سی آتی ہے۔ بائی اماں کی مجبوریاں اپنی جگہ ہیں_____ لیکن اگر اس سے پیشہ نہیں کرانا تھا تو پھر پڑھایا کیوں؟ پڑھایا تو اس ماحول میں کیوں رکھا؟

دماغ میں بم کے گولے چھوٹ رہے تھے۔ کتابیں اسے جلتی ہوئی محسوس ہوئیں۔ اس نے اپنا پورا غصّہ ان کتابوں پر نکالا.....طیش میں آ کر میز کی ساری کتابیں پھینک دیں_____ کاغذ نوچے، کتابوں کے ورق پھاڑے_____

وہ پاگلوں کی طرح کر رہی تھی_____

زمین پر کتابوں کے انبار لگے تھے_____ اچانک وہ جھکی_____ پھٹے کاغذوں کو مٹھی میں اٹھایا سسکیاں لے لے کر رونے لگی_____

لیکن آنسو اس مسئلے کا حل کہاں تھے_____

سازندوں نے پھر ساز اٹھا لئے تھے_____

مجرا شروع ہونے میں ابھی کچھ دیر تھی_____

ایک نئے فیصلے کے بعد افروز بیگم اچانک ایک جھٹکے سے اٹھ کھڑی ہوئیں۔

بائی اماں، خراب ہو گئے میک اپ کو درست کرنے میں.....اور خود کو تر و تازہ کرنے کی جدوجہد میں ایک بار پھر آئینے کے سامنے تھیں۔

آئینے میں افروز کا عکس نظر آیا تو وہ اچانک پلٹیں ـــــــ

''افروز.....تم.....؟''

افروز نے روتی آنکھوں سے ہاتھوں میں پکڑا ہوا گھنگھرو بائی اماں کی طرف اُچھال دیا۔ پھر بائی اماں کو دیکھتی ہوئی بولی۔

''روز کے ہنگاموں سے تو بہتر ہے بائی اماں کہ آپ یہ گھنگھرو میرے پیروں میں ڈال دیجئے۔''

بائی اماں حیرت زدہ سی اسے دیکھتی رہ گئیں ـــــــ

''بیٹی افروز.....تمہاری طبیعت تو.....''

''آج میں فیصلہ سننے آئی ہوں بائی اماں ـــــــ یا تو آپ مجھے یہ گھنگھرو پہنائیے یا اس ماحول سے دور لے جائیے۔''

بائی اماں نے پہلی بار افروز کے چہرے پر ایک نئے انقلاب کے تیور دیکھے۔ وہ بس اتنا ہی سوچ سکیں۔ افروز جوان ہو گئی ہے۔

تبھی سازندے نے آ کر خبر دی۔ لوگ آ گئے ہیں، انتظار ہو رہا ہے ـــــــ

''آج مجرا نہیں ہوگا۔''

بائی اماں نے سر جھکا لیا اور بالیاں اتارنے لگیں ـــــــ

(9)

نواب الطاف حسین نے نظر اٹھائی اور کمزور آواز میں بولے۔

''یہ عزت بھی بڑی عجیب چیز ہوتی ہے گوہر جان.....عزت کا خیال نہ ہوتا تو کب کا تمہیں تسلیم کر چکا ہوتا اور تمہیں یہ دن دیکھنے نہ پڑتے۔''

گوہر جان کی آواز تھرتھرائی۔

''افروز کا کیا کریں گے، وہ اپنی پڑھائی کا انعام مانگتی ہے۔''

نواب صاحب کی آنکھوں میں دھیرے سے ایک بجلی چمکی ـــــــ پھر بجھ گئی۔

''گوہر جان تو خدا کی ستائی ہوئی عورت ہے الطاف حسین.....افروز کی قسمت تو اچھی بنا دیجئے۔ یہ آپ کا فرض بھی ہے۔''

نواب جیسے ایک دم سے بے سہارا ہو گئے۔ اس کمزور بوڑھے کی طرح ـــــــ جس کی لاٹھی اچانک ٹوٹ گئی ہو ـــــــ اور اس کی دھندلی آنکھیں اندھیرے میں لڑکھڑاتے ہوئے، ٹوٹی لاٹھی کو جوڑنے کی کوشش کر رہی ہوں۔

''میرے بچے.....اب ان کی آنکھوں میں شک کے کیڑے پڑ گئے ہیں گوہر جان..... میں اتنی دیر تک کہاں رہتا ہوں۔ کہاں جاتا ہوں..... وہ جان گئے ہیں۔ وہ نئی تہذیب کے ہیں گوہر جان..... وقت بدلا ہے۔ چلن بدلا ہے۔ کوٹھے پر شرفاء کے جانے کی روایتیں اب پرانی کتابوں میں گم ہو چکی ہیں ـــــــ نئے زمانے کے بچوں کے لئے یہ بدتہذیبی کی علامت ہے..... جب دیکھتا ہوں کہ ان کی آنکھوں میں میرے لئے عزت و احترام کا جذبہ نہیں رہا، تو دل پر چوٹ سی لگتی ہے۔ قریشہ اب بڑی ہو رہی ہے گوہر جان..... میں نے قریب سے اس کی آنکھیں دیکھی ہیں

گوہر جان۔ اسے مجھ سے نفرت ہے..... ہاں مجھ سے..... پنے باپ سے شدید نفرت ہے گوہر جان.....

گوہر جان اچانک سناٹے میں آ گئیں۔

''لیکن یہ سب آپ مجھے کیوں بتا رہے ہیں؟''

''اس لئے کہ تم جان لو، میں لاچار ہوں ـــــ مجبور ہوں ـــــ اپاہج اور کمزور ہوں۔ میں کچھ نہیں کر سکتا۔''

''تم کمزور کب نہیں تھے۔ گوہر جان کے جی میں آیا کہ چیخ چیخ کر نواب صاحب کو پھٹکارے، انہیں صلواتیں سنائے..... کہ تم کمزور کب نہیں تھے نواب صاحب۔ ہمارے یہاں ہجڑوں کی بھی ایک قوم ہوتی ہے۔ تم تو ان سے بھی بدتر ہو نواب الطاف حسین..... یہ بدذات بانگڑو تو ناچ کر، گا کر، لوگوں کا دل بہلا کر دوسروں کے لئے سکون تو ڈھونڈ لیتے ہیں..... اور تم..... گھر کی چھوڑو، اس کوٹھے کی بات رہنے دو الطاف حسین ـــــ تمہارے پاس تو اپنا سکھ چین بھی نہیں..... سب کچھ گنوا چکے ہو تم ـــــ مسلم ریاستوں کی طرح ـــــ مسلمان بادشاہوں کی طرح..... تال پیٹو تال..... ہے کیا تمہارے پاس.....؟

اس کا جی چاہا..... اتنی زور سے چیخے کہ سارا محلّہ جمع ہو جائے۔ لیکن خود کو کمزور اور اپاہج بتانے والے نامرد سے شکوہ ہی کیا کرنا..... اس نے گھن سے، نفرت سے نواب صاحب کو دیکھا..... جو اس وقت، لوٹتے ہوئے بدّی سے بھی زیادہ گھناؤنے اور ذلیل لگ رہے تھے.....

''جاؤ عاقبت سدھارو.....''

بچی کے لئے گوہر جان کے دل میں دنیا بھر کا پیار انگڑائیاں لے رہا تھا..... ''افروز جان..... اتنا بھی نہیں ہوا کہ بچی کی بلیاں لے لیں۔ نئے اور پرانے زمانے کا فرق سمجھا رہا ہے..... بڈھا کھوسٹ..... کیڑے پڑیں..... تہذیب اور بدتہذیبی کی کتابیں کھول کر بیٹھتا ہے۔

●●

نواب صاحب تو کب کا دروزہ کھول کر چلے گئے ـــــ مگر گوہر بائی کے جسم میں ہزاروں توپ چھوٹ رہے تھے..... ان کا جی چاہا اچانک پھوٹ پھوٹ کر رو پڑیں.....

لیکن کیوں.....؟

کس لئے.....؟

اس نواب کے بچے کے لئے..... جسے سچ اور جھوٹ کی پرچھائیوں کا احساس تک نہیں.....

کھٹ..... گوہر جان نے دروازہ نہیں بند کیا، بلکہ نواب صاحب تک دل کی کھلنے والی کھڑکی پر سانکل چڑھا دی ''..... افروز سے تمہارا رشتہ نہیں..... تو میرا بھی نہیں۔ دوسرے گاہکوں کی طرح تم بھی ایک گاہک ہو۔''

●●

وقت گزر گیا..... یا.....

وقت گزر جاتا ہے اور ہم حقیقت کے کمزور اور نازک پل پر سوار ہو جاتے ہیں.....

کمزور اور نازک پل ـــــ تیز، موسلا دھار بارش سے ڈھا جانے والا پل ـــــ

بارش تیز ہو گئی ہے۔

لکڑی کا کمزور پل کانپ رہا ہے۔

یہ پل کبھی بھی ٹوٹ سکتا ہے۔ کبھی بھی گر سکتا ہے ـــــ

اس وقت گوہر جان کچھ ایسا محسوس کر رہی تھیں ـــــ

(10)

سڑک پر ہنگامہ مچ گیا۔

شٹر جلدی جلدی گرنے لگا۔ دکانیں بند ہونے لگیں..... لوگ تیزی سے ادھر اُدھر بھاگ رہے تھے۔ بالکنی پر لٹکے ہوئے کپڑوں کے درمیان سے تھوڑا سا سر نکال کر یہ منظر گوہر جان نے بھی دیکھا۔ چاروں طرف افراتفری مچی تھی..... آس پاس کی کھلی کھڑکیوں سے جھانکتی طوائفوں کے درمیان، آنکھوں آنکھوں میں وحشت کے کچھ مکالمے بھی ہوئے_____

مکالمے..... سناٹے بھرے_____

مکالمے..... ایک سنگین چپ لیے_____

مکالمے..... آنکھوں آنکھوں میں جیسے موت دیکھتے ہوئے۔ تلاش کرتے ہوئے_____

جب تک گوہر جان کمرے میں بھاگتی، بدی ماماں لڑکھڑاتے قدموں سے اندر آ چکے تھے۔ ان پر جیسے وحشت سوار تھی۔ پاگل پن کا دورہ پڑ گیا تھا۔

پھٹی پھٹی آنکھیں لئے افروز نے بائی اماں کو دیکھا۔ بدی ماما دروازے کی طرف ہنہناتے ہوئے بھاگے تھے_____

بائی اماں لگ بھگ چیخ اٹھیں۔

''پاگل ہو گئے ہو بدی..... باہر طوفان مچا ہے۔''

''ہوں..... ہاں.....''

''کدھر جا رہے ہو۔''

''ہوں..... ہاں.....''

''دماغ خراب ہو گیا ہے.....''

بدی دوبارہ پلنگ پر آ کر بیٹھ گئے۔ سر کو ہاتھوں سے تھام لیا۔ پھر کسی ننھے بچے کی طرح بستر پر لیٹ گئے۔

ایک سازندے نے آ کر خبر دی..... بری خبر ہے۔ حالات کچھ اچھے نہیں_____ ہندوؤں کے دھارمک جلوس کے نتیجے میں مسلمانوں نے بھی اپنا جلوس نکالا تھا۔ کم بخت پاگل کتے نے کاٹا تھا۔ تقریریں بھی کیں..... جو جی میں آیا، گالیاں دیں۔ سرکار کو بھی۔ ان کے نیتاؤں کو بھی اور تو اور ان کے دھرم کو بھی..... نتیجے میں لاٹھی چل گئی۔ نیوسٹی ایریا میں کافی ہنگامہ ہے۔ ہندوؤں نے مسلمانوں کے کئی گھر پھونک دیئے۔''

''باپ رے۔''

بائی اماں ایک دم سے چونک گئیں۔ اب کیا ہوگا پروردگار..... نیوسٹی ایریا یہاں سے زیادہ دور نہیں تھا۔ اماں نے خوفزدہ آنکھوں سے افروز کو دیکھا۔ پھر لڑکھڑائی آواز میں بولیں۔ ''دیکھتی کیا ہو..... قرآن پاک نکالو..... سورہ یٰسین کی تلاوت کرو۔ اللہ پاک ہر بری بلا سے محفوظ رکھے..... آمین۔''

طاق پر قرآن شریف پڑا تھا۔ بائی اماں نے جزدان سے قرآن شریف نکالا۔ آنکھوں سے لگایا۔ پھر پڑھنے بیٹھ گئیں۔ تبھی باہر اچانک تیز شور بلند ہوا_____ جیسے ہزاروں پٹاخے مل کر ایک ساتھ چھوٹ گئے ہوں_____ جئے بجرنگ بلی کے نعروں سے پوری فضا ہل گئی۔

بائی اماں کو جیسے کاٹو تو خون نہیں۔

''یا پروردگار قسمت کو کون سے دن دیکھنے ہیں.....'' آواز گلے میں پھنس کر رہ گئی.....

بدی ماما کانپتے ہوئے بستر سے اٹھے۔ پھر جیسے بے ہوش ہو کر گر پڑے۔

افروز تیزی سے چیخی.....

اماں تیزی سے بالکنی کی طرف بھاگیں_____

آگے..... باڑے پر کا، صلاح الدین کا مکان آگ میں دھواں دھواں کر کے جل رہا تھا۔

''یا الٰہی.....''

دہشت کی آگ جیسے ان کو بھی جلاتی ہوئی نکل گئی۔

''نہیں.....بائی اماں کے جسم کے اندر، جیسے خوف کے ڈھیروں سانپ گھس گئے_____

''اب کیا ہوگا؟''

''ہائے اللہ اب کیا ہوگا۔'' آنکھوں کے آگے بس یہی خوف بھرا سوال پنڈولم کی طرح جھول رہا تھا.....ہونٹوں تک کتنی ہی آیتیں آ کر چپ لگا گئیں_____ ہونٹ لرز کر رہ گئے۔

اب.....؟

یہ سوال تو افروز کی آنکھوں میں بھی تھا.....

بائی اماں نے دروازے کو ٹھوک بجا کر دیکھا کہ ٹھیک سے بند ہے یا نہیں۔ آس پاس کا ماحول بھی عجب تھا۔ وحشت ناک سروں میں پاس پڑوس کی طوائفوں کے رونے کی آوازیں آ رہی تھیں۔

بائی اماں اور افروز، دونوں پاس پاس، سکتہ جیسے حالت میں کھڑے، زمین پر بے ہوش پڑے بدی ماما کو گھور رہے تھے_____

بڑھتی آوازوں کا شور جیسے ایک دم سے بہت قریب آ گیا_____

بائی اماں کی آنکھوں میں موت سما گئی.....یا.....ال.....لہ.....

چیخ و پکار جیسے کان کے پردے پھاڑ رہے تھے۔

بائی اماں کا کلیجہ دھک سے رہ گیا۔ وہ پاگلوں کی طرح چیخیں.....''افروز، باہر والی کھڑکی کھول دے۔ کچھ ہوا تو.....تو اس سے اتر کر بھاگ جانا۔ میں.....''

●●

کیسا لگتا ہے قریب سے موت کو دیکھ کر_____ جب موت کا سایہ بہت پاس ہو.....

باہر شور تھا.....آسمان پر رینگتا، پھیلتا دھواں تھا_____

اور اچانک بائی اماں کے دروازے پر ایک زوردار لات پڑی.....دروازے کی چولیں ہل گئیں۔

''افروز.....جلدی کرو.....''

بائی اماں تھر تھر کانپنے لگیں.....

دروازے پر جیسے موت کا تانڈو رقص شروع ہو گیا۔ دروازہ جھول رہا تھا۔ لات، جیسے برابر پڑ رہی تھی_____

افروز تیزی سے کھڑکی پر چڑھ گئی۔ اب سوچنے سمجھنے کا وقت ہی کہاں تھا۔ دوسری طرف خالی چھت تھی۔ کھڑکی اور چھت کے درمیان فاصلہ کم تھا۔ قریب اَڑھائی فٹ کا۔

بائی اماں کا پورا جسم جیسے تھر تھر کانپ رہا تھا.....

دروازے پر مستقل لاتوں کی بوچھار ہو رہی تھی.....

ایک.....

دو.....

تین.....

پھر گالیوں کے شور ابھرے۔

اور پھر وہ ہوا، جسے ہونا ہی تھا۔ دروازہ ایک تیز دھکے کے ساتھ ٹوٹ گیا۔ بائی اماں کی ایک زوردار چیخ آسمان کو چھید کرتی چلی گئی۔

سامنے۔ قہقہے بکھیرتا، ہاتھوں میں جلتی مشعل لئے جاگیرا کھڑا تھا_____ اور جاگیرا کے پیچھے کئی لوگ نعرہ لگاتے، سفاک چہروں کے ساتھ بائی اماں کو دیکھ رہے تھے۔ پھر اچانک ایک عجیب بات ہوئی۔

بدّی ماما کو جیسے اچانک ہوش آ گیا۔ اس سے پہلے کہ دہشت گرد کچھ کر پاتے_____ وہ تیزی سے اٹھا اور بالکنی سے سڑک کی طرف ایک جھٹکے میں چھلانگ لگا دیا۔

بائی اماں کا دل جیسے باہر نکل آیا_____

●●

سامنے موت ناچ رہی تھی۔

بائی اماں خوفزدہ آنکھوں سے اب جاگیرا کو اپنی طرف بڑھتا ہوا دیکھ رہی تھیں۔

''افروز کہاں ہے.....؟''

''و.....ہ.....''

بائی اماں تھر تھر کانپ رہی تھیں۔

''افروز کہاں ہے.....؟''

بائی اماں نے خوفزدہ آنکھوں سے کھڑکی کی طرف دیکھا ـــــ جواب خالی پڑی تھی۔

''بھگا دیا؟''

جاگیرا نے غصّے میں گرم گرم جلتی ہوئی مشعل بائی اماں کے چہرے سے سٹا دیا ـــــ

بائی اماں نے ایک تیز، ذبح ہونے والے جانور کی طرح بھیانک چیخ ماری۔

جاگیرا دوڑتا ہوا کھڑکی تک آیا۔ اسے دور بھاگتا ہوا ایک سایہ نظر آیا ـــــ

''چلو.....''

جاگیرا نے اشارہ کیا ـــــ

مشعل بردار لوگوں نے بائی اماں کے گھر کو آگ لگا دی..... باہر سے دروازہ بند کر دیا۔

بائی اماں کی خوفناک چیخیں دیر تک بلند ہوتی رہیں۔

پھر آواز شانت ہو گئی۔

دہشت گرد، سائے کے پیچھے بھاگ چکے تھے ـــــ اور بائی اماں کا مکان آگ کے بھیانک شعلوں میں دھو..... دھو کر جل رہا تھا ـــــ

(11)

کسے موردِ الزام ٹھہرایا جائے..... موت تو جیسے سب کے تعاقب میں نکل پڑی ہے.....

افروز کا سینہ اب بھی خوف سے اوپر نیچے ہو رہا تھا۔ وہ کھڑکی سے کودتی نہیں تو اور کیا کرتی.....

سامنے موت تھی..... آگے پیچھے، دائیں بائیں.....

چاروں طرف.....

اس پر جیسے وحشت سوار تھی ـــــ

باہر دروازہ ہل رہا تھا۔ ایل لمحہ میں اس نے فیصلہ کر لیا۔ وہ کود جائے گی اور وہ کود گئی۔

اڑھائی تین فٹ کی اونچائی کم نہیں ہوتی لیکن ایسے وقت میں انسان کے پاس زبردست ہمت آ جاتی ہے۔ آس پاس دو تین چھت سٹے سٹے تھے ـــــ

افروز سرپٹ دوڑتی چلی گئی۔

ایک بار اس نے پلٹ کر دیکھا۔

اس کے اپنے مکان سے دھواں اٹھ رہا تھا ـــــ شعلے آسمان چھونے لگے تھے ـــــ ذرا دور پر اس نے بے رحم سایوں کو دیکھا اور وہ سرپٹ بھاگتی چلی گئی۔

بھاگتے بھاگتے وہ کب ایک پولیس جیپ سے ٹکرائی پتہ بھی نہیں چلا ـــــ اس کی سانس پھول رہی تھی۔

سامنے والے کو اس نے غور سے دیکھا۔ وہ ایک باوردی آفیسر تھا۔ وہ شاید سارا ماجرا سمجھ چکا تھا۔

''یہاں کوئی جان پہچان کا ہے؟''

''نہیں۔''

اس کا چہرہ خوف سے دہل گیا۔

''کوئی رشتے دار؟''

''نہیں۔''

''کوئی ایسی جگہ جہاں تمہیں چھوڑ سکوں؟''

''جی.....''

ایک لمحے کو اچانک اسے نواب صاحب کے گھر کی یاد آ گئی۔ بائی اماں نے ایک دن باتوں باتوں میں نواب صاحب کی حویلی کا ذکر چھیڑا تھا۔ اس نے یہی پتہ بتا دیا۔

باوردی افسر چونک پڑا۔

''ارے یہ تو نواب صاحب کا گھر ہے!''

''مجھے وہیں چھوڑ دیجئے۔ لیکن.....''

اس نے خوف سے جھرجھری لیتے ہوئے افسر سے کہا۔ ''لیکن پلیز، آپ مجھے چھوڑ کر چلے جائیں گے ـــــ ورنہ پتہ نہیں نواب صاحب کیا سوچ لیں۔''

باوردی افسر نے کچھ سوچ کر حامی بھر لی۔

''ٹھیک ہے یہ جگہ محفوظ ہے۔''

انسپکٹر نے اسے جیپ پر بٹھا لیا۔ جیپ چل پڑی۔ افروز کا سینہ اب بھی دھونکنی کی طرح چل رہا تھا۔ ایک پرانی حویلی کے آگے، جس کی رنگت دھیمی پڑ چکی تھی، انسپکٹر نے جیپ روک دی۔ اشارہ کیا۔

''یہی ہے۔ آپ یہاں پہلے بھی کبھی آئی ہیں؟''

''نہیں''۔

''کوئی بات نہیں۔''

●●

یہ علاقہ سچ مچ محفوظ تھا ـــــ لیکن شاید شہر میں ہونے والے دنگوں کی خبر یہاں والوں کو مل چکی تھی۔

گھر، دروازے، کھڑکیاں سب بند تھے۔

سڑک سنسان ـــــ

''یہی ہے۔''

''یہی ہے نواب صاحب کی حویلی۔''

زردی مائل اور رونق سے محروم جھڑتی دیواروں والی اس حویلی کو غور سے دیکھا افروز نے۔ خوف سے سانسیں اب تک پھولی ہوئی تھیں۔

حویلی کا بڑا سا پھاٹک اب اس کے ہاتھوں کی جنبش کا منتظر تھا۔

پھر اچانک جانے کیا ہوا کہ وہ زور زور سے دروازہ پیٹنے لگی۔ گھڑگھڑاتی ہوئی آواز اس کے منہ سے نکلی۔

''کھو..... لیے..... خدا کے واسطے دروازہ کھولئے.....''

●●

پھر..... دروازے کے پاس آ کر چند دوڑتے ہوئے قدم جیسے ٹھٹھک گئے۔

دروازہ کھل گیا.....

افروز نے سوجی، پھولی آنکھوں سے دیکھا ـــــ دروازے پر اس کی ـــــ ایک ہم عمر لڑکی کھڑی تھی۔

لڑکی کے پیچھے، عمر میں اس سے دو ایک برس بڑا ایک لڑکا کھڑا تھا۔

دونوں کی آنکھوں میں ایک ہی سوال تھے۔

''کون ہو تم۔''

''نواب صاحب..... ہیں۔''

ابھی اس کے لب پر لفظ تھرتھرائے ہی تھے کہ نواب صاحب ظاہر ہو گئے ـــــ اسے لٹی لٹی حالت میں دیکھ کر جیسے وہ اپنی جگہ پتھر ہو گئے۔

''تم..... یہ سب ـــــ؟''

نواب صاحب نے پیچھے پلٹ کر اپنی بیوی اور بچوں کی طرف دیکھا۔ ''میرے دوست کی بیٹی ہے۔ اندر آ جاؤ بیٹی۔''

افروز اندر آ گئی۔

نواب صاحب نے اشارہ سے سب کو جانے کے لئے کہا اور افروز کو لے کر اپنے کمرے کی طرف بڑھ گئے۔

(12)

آج حویلی میں افروز کی آمد کا تیسرا دن تھا_____

نواب صاحب گھر والوں کو یہ سمجھانے میں کامیاب ضرور ہوئے کہ یہ ان کے دوست مرحوم و مغفور شوکت حسین کی بیٹی ہے، جن کا پورا گھر دنگے میں شہید ہو گیا۔ سب کی ہمدردی اس کے ساتھ تھی۔ ذرا سی دیر میں وہ سب سے واقف ہو گئی۔

امی جان..... جو نواب صاحب کی بیوی تھی_____ کم بولتی تھیں_____ لیکن محبت سے بات کرتیں تو لگتا جیسے منہ سے پھول جھڑ رہے ہوں۔

وہ لڑکی جس نے دروازہ کھولا تھا، وہ قریشہ تھی، نواب صاحب کی لڑکی_____

اور وہ لڑکا انور حسین تھا۔ نواب صاحب کا لڑکا، جو انجینئرنگ کر رہا تھا_____

نواب صاحب نے گھر میں سب کو اس بات کے لئے منع کر رکھا تھا کہ افروز کے زخم کو نہ کریدا جائے۔ کوشش کی جائے کہ اس کے زخم بھر جائیں۔

قریشہ اور انور تو اتنے پیارے لگے کہ افروز کا جی چاہتا تھا کہ وہ یہاں سے کبھی نہ جاتی۔ آخر یہ اس کا بھی گھر ہے۔ اس گھر پر اس کا بھی حق ہے۔

مگر کیسا حق.....؟

ناجائز گوشت کے لوتھڑے جیسا.....

افروز نے دیکھا اور محسوس کیا کہ حویلی کھنڈر میں بدل رہی ہے۔ لیکن مرا ہوا ہاتھی بھی سوا لاکھ کا ہوتا ہے۔ پرانے زمانے کے صوفے، قالین، جھاڑ فانوس_____ پرانی نوابیت کی کہانی بیان کر رہے تھے۔ رئیسی چھن گئی۔ جاگیریں ختم ہو گئیں۔ لیکن یہ مرے ہوئے ہاتھی اپنی نوابی شان

کا بھرم قائم رکھنا چاہتے تھے۔ افروز کو یہ سن کر اچھا لگا کہ قریشہ اور انور کو خود کا نواب کہلانا پسند نہیں تھا۔ انور نئے مزاج کے شہر کی پیداوار تھا۔ وہ سلجھی ہوئی باتیں کرتا تھا۔ گھر میں نوکر چاکر نہیں تھے۔ افروز کو لگا، نواب صاحب کے ہاتھ تنگ رہے ہوں گے۔ تبھی تو بائی اماں کے کافی اصرار کے باوجود نواب صاحب ان کے یہاں پکا سنڈاس نہیں بنوا پائے تھے۔ نواب صاحب کو اب بھی افروز سے خطرہ تھا۔ اس لئے وہ چاہتے تھے کہ جلدی سے معاملہ ٹلے۔ شہر کی فضا ٹھیک ہو جائے تاکہ وہ اسے چلتا کر دیں۔

وہ اس دن افروز کو دیکھ کر ڈر گئے تھے۔

اپنے کمرے میں افروز کو لانے تک نواب صاحب خود کو سنبھال چکے تھے۔

''تم..... یہاں.....؟''

روتے ہوئے افروز نے کم سے کم لفظوں میں بدی ماما کے کود جانے اور جاگیرا کے آگ لگانے کی ساری داستان نواب صاحب کو سنا دی۔

ایک لمحے کو نواب صاحب کا جسم، جیسے لفظوں کی تیز آندھی سے لڑکھڑا گیا۔

وہ کمرے میں ٹہلنے لگے_____

افروز روئی جا رہی تھی۔

''اب.....''

بے چینی کی حالت میں ٹہلتے ہوئے نواب صاحب اس کے آگے رکے.....

''اب..... کیا سوچا ہے.....''

''مجھے کچھ دن یہاں رکنے کی اجازت دیجئے نواب صاحب، پھر یہاں سے چلی جاؤں گی۔''

''کہاں.....؟''

''سوچا ہے راجدھانی چلی جاؤں گی۔ وہاں کوئی نہ کوئی کام تو..... میں اس شہر سے، یہاں کی یادوں سے دور بھاگ جانا چاہتی ہوں نواب صاحب.....''

''ٹھیک ہے..... وہاں میرے ایک دوست ہیں، خط دے دوں گا۔''

نواب صاحب کی بے چینی دور نہیں ہوئی تھی۔ وہ رکے..... پھر نظر ترچھی کر کے بولے۔

''ہاں! سنو.....تم مجھے نواب صاحب کے بدلے انکل کہا کرو۔ یہاں انکل کہنے کا رواج ہے۔''

پھر وہ تیزی سے اندر چلے گئے۔

افروز پھر سے آنسوؤں میں ڈوب گئی۔ وہ اس وقت چونکی جب وہ دو نرم، شفقت بھرے ہاتھوں کی زد میں تھی۔ یہ امی جان تھیں، جو کہہ رہی تھیں۔

''تم فکر نہ کرو بیٹی.....نواب صاحب نے مجھے سب کچھ بتا دیا ہے۔ گھر لٹنے کا غم مت کرو۔ صبر سے کام لو.....''

پھر دھیرے سے انور آگے بڑھا۔ پھر قریشہ آگے آئی ـــــــ

اور اسے لگا..... یہ نئی دنیا ہے..... یہ محبت کی نئی وادی ہے، جسے نواب صاحب اس سے اب تک چھپائے ہوئے تھے۔

''آؤ بیٹی.....منہ ہاتھ دھولو.....''

امی جان دنیا کی تمام محبت ہونٹوں پر سجا کر بولیں ـــــــ اور نڈھال سی افروز اجنبی بھائی بہنوں کے ساتھ چل پڑی۔

(13)

قریشہ کو تو ہر وقت شرارتیں سوجھتی تھیں۔ اس کی رگ رگ میں شرارتیں بھری تھیں۔ انور ذرا سنجیدہ قسم کا نوجوان تھا۔ دونوں نے کتنی ہی بار باتوں باتوں میں اس کے گھر کے متعلق پوچھنا چاہا لیکن ہر بار امی جان بات ٹال جاتیں۔ وہ دونوں بھی ذہین تھے۔ افروز کا دل نہ دکھے، اس لئے فوراً ہی بات بدل دیتے تھے۔

وقت کے ساتھ انسان کی ضرورتیں بھی بدلی تھیں۔ ضرورتوں نے پاؤں پھیلانے شروع کر دیئے تھے۔ افروز نے محسوس کیا کہ نواب صاحب زیادہ تر چپ ہی رہتے ہیں۔ یا پھر اپنے کمرے میں، مسہری پر تکیے سے ٹیک لگائے سوچ میں ہوتے ـــــــ بچوں سے بھی کم ہی باتیں کرتے ہیں۔ زیادہ تر بس ہوں..... ہاں..... یا ضرورت ہوتی تو دو چار لفظ بول دیا۔

ضرورتوں کے پھیلتے ہوئے 'دائرے' افروز نے اس دن کھانے کی میز پر ہی دیکھا تھا۔ دسترخوان پر کھانے چن دیئے گئے۔ لوگ بیٹھ گئے انور نے دسترخوان پر پسری خاموشی کو توڑتے ہوئے کہا۔

''ابا۔ حویلی کی اتنی ساری زمین بے مصرف پڑی ہے، آخر ان کا کیا کام؟''

نواب صاحب نے نظر اونچی کی ـــــــ غور سے انور کی طرف دیکھا ـــــــ ایک لمبی ہوں کی اور روٹی کا نوالہ توڑنے لگے۔

''میرا خیال ہے بینک سے قرض لے کر ایک مارکیٹ کمپلیکس بن جائے تو.....اور اوپر ہماری رہائش ہو جاتی.....''

نواب صاحب نے اس بار ہوں نہیں کی۔ اچانک کھانے سے ہاتھ روک دیا۔ امی

جان گھبرا گئیں۔قریشہ نے نفرت بھری آنکھوں سے نواب صاحب کو دیکھا جو کھانے سے اچانک اٹھ گئے تھے۔

''اب آپ بڑے ہو گئے ہیں۔جو مرضی آئے کیجئے۔''

نواب صاحب غصّے میں چلے گئے۔

امی جان نے کھانا روک دیا——

''یہ کیا بات ہوئی انور؟''

قریشہ کی آنکھوں میں اب بھی نفرت موجود تھی—— 'بھیّا نے غلط کیا کیا'

''لیکن کھانے کے وقت، ذرا خیال تو کیا ہوتا۔''

''خیال کرنے نہ کرنے سے کیا ہوتا ہے امی جان.....نواب صاحب نے کب آپ کا خیال کیا—— خیال کیا ہوتا تو اس دو ٹکے کی طوا.....!''

امی کا سارا بدن کانپ گیا.....افروز بھی جیسے زرد پتے کی طرح لرز اٹھی.....تو کیا گھر میں سب کو معلوم ہے کہ نواب صاحب اس دو ٹکے کی.....بائی اماں کے پاس جاتے تھے.....!

''پیاری امی جان.....!''

قریشہ نے گڑگڑا کر معافی مانگی.....انور نے قریشہ کی حمایت میں کہا۔

''ابا کو خیال تو آنا چاہئے امی جان، کہ لے دے کر ایک ''گولا'' رہ گیا ہے جہاں سے پیسہ آتا ہے۔اسی پیسے پر سارا گھر چلتا ہے—— پھر اتنی بڑی بڑی دیواریں، محرابیں، اتنے سارے کمرے.....اور رہنے والے صرف دو تین.....فائدہ ہی کیا ہے۔مسلمان نے تجارت کا ہنر تو سیکھا ہی نہیں، صرف ماضی کی کہانیوں پر خوش ہوئے جا رہے ہیں۔''

امی جان نے دبی زبان سے کہا۔

''ابا نے آج بھی کھانا چھوڑ دیا۔''

''کون سی نئی بات ہے۔ابا تو ہمیشہ اٹھ کر چلے جاتے ہیں۔گھر کے مسئلے پر ان سے بات کرنا بھی ایک آفت ہے۔'' قریشہ غصّہ سے بولی۔

انور آہستہ سے بولا۔''فرار کسی مسئلے کا کوئی حل نہیں رہا۔اب وہ زمانہ نہیں رہا جب خالی ہاتھ بھی لڑکیاں ڈولی پر چڑھ جایا کرتی تھیں۔ابا تو جیسے لین دین جانتے ہی نہیں ہیں۔ہمارے پاس دوسری کوئی جاگیر نہیں ہے۔لے دے کر بس یہی حویلی ہے۔میرا کیا ہے، کل کو انجینئر بن

جاؤں گا—— لیکن ابھی وقت ہے۔آپ لوگ ہیں۔گھرانے کی عزت ہے اور اس عزت کو بچانے کے لئے صرف یہی گھر ہے۔ابا سے بات تو کرنی ہی ہوگی۔''

وہ بڑوں جیسی باتیں کر رہا تھا۔

افروز کو اچھا لگا۔

لیکن قریشہ بگڑ گئی۔

''یہ بری بات ہے بھیا۔تم نے آخر مجھے سمجھ کیا رکھا ہے۔مجھے بکاؤ لوگوں سے سخت نفرت ہے۔''

امی اچانک چپ ہو گئیں۔

پہلے انور.....پھر امی جان.....سب بوجھل قدموں سے ہاتھ دھونے کے لئے آگے بڑھ گئے۔

(14)

صبح صبح انور نے خبر سنائی۔

''سلمان میاں گرفتار کر لئے گئے!''

''کون سلمان میاں؟ وہی ناجنہوں نے مسلمانوں والے جلوس کی قیادت کی تھی۔'' قریشہ نے پوچھا۔

''ہاں وہی۔ مسلمانوں کی قیادت۔'' انور ایک طنزیہ ہنسی ہنسا ـــــ ارے یہ کیا مسلمانوں کی قیادت کریں گے۔ یہ تو لڑنا جانتے ہیں۔ دنگے جانتے ہیں۔ فساد جانتے ہیں۔ جب سے آنکھ کھولی ہے تب سے فساد ہی تو دیکھ رہا ہوں۔ بچپن میں مہاتما گاندھی اور وطن پرستی کی کہانیاں پڑھتا تھا۔ اب ہنسی آتی ہے۔ وہ لوگ کہاں گئے۔ ایک غلامی سے نجات دلانے کے بعد اس دوسری، ذہنی غلامی سے نجات دلانے والے رہنما کب جنم لیں گے۔''

افروز ایک دم سے چونک پڑی۔

قریشہ کے لہجے میں بھی نفرت تیر رہی تھی۔

''کبھی نہیں بھیا۔ وہ غلامی اس سے کہیں بہتر تھی۔ اس سے زیادہ ذہنی، جسمانی اور روحانی غلامی تو کبھی آئی ہی نہیں۔ ہم ایک بدترین دور میں داخل ہو چکے ہیں۔''

انور نے حیرت زدہ آنکھوں سے دیکھتی افروز کو دیکھا پھر روانی میں بولتا چلا گیا۔

''تم اور تمہارا قصور ہی کیا تھا افروز۔ چند دہشت پسندوں نے مذہب کے نوالے اچک لئے۔ تمہارا گھر بار لوٹ لیا گیا۔ تمہیں بے سہارا کر دیا گیا۔ مسلمانوں کو لو، تو سب سے پہلے انہیں اپنا ذہن بدلنا پڑے گا۔ اپنی سوچ میں تبدیلی لانے پڑے گی۔ ذہن کو سیکولر بنا کر چلنا ہوگا۔''

''لیکن یہ سب ممکن کیسے ہے؟''

بہت دیر بعد کچھ کمزور سی آواز میں افروز نے پوچھا ـــــ

قریشہ نے چونک کر دیکھا ـــــ انور نے بھی غور سے اس کے چہرے کا جائزہ لیا۔

''ممکن ہے، سب کچھ ممکن ہے۔ شک اور خوف کی جڑیں یونہی نہیں پھیلتیں۔ نفرت کے بیج یونہی خود سے نہیں پیدا ہو جاتے۔ تالی دونوں ہاتھ سے بجتی ہے۔ یوں تالی بجانے کا کارنامہ تو سیاسی مہرے انجام دیتے ہیں۔ لوٹ پاٹ اور دہشت کا ماحول غنڈے اور بدمعاش پیدا کرتے ہیں لیکن کہیں نہ کہیں کوئی اہم بھومیکا ہماری بھی ہوتی ہے افروز..... کبھی جانے انجانے ہمارے اندر بھی مذہب کے انجکشن لگائے جاتے رہتے ہیں۔''

''کیسے.....؟''

''میں بتاتا ہوں.....''

انور نے گہرا سانس لیا، پھر بولنا شروع کیا ـــــ ''میرا دوست رشید کہتا ہے، جب وہ بہت چھوٹا تھا۔ اپنے ہم عمر ہندو دوستوں کے ساتھ محلے میں کھیلتا تھا تو اس کے ماں باپ خوفزدہ رہتے تھے۔ ہندوؤں کے ساتھ کیوں کھیلتے ہو؟ وہ پٹ کر گھر آتا تھا تو ماں باپ کے دو چپت لگ جاتے تھے۔ کیوں کھیلتے ہو..... لیکن جب وہ پیٹ کر گھر آتا اور یہ بات معلوم ہو جاتی تب اس کی ماں کہتی تھی..... کیوں رے کم بخت، دنگا کروائے گا ـــــ تم ہندو ہو، تم مسلمان ہو۔ یہ بیج تو گھر والے ہی ڈالتے ہیں افروز..... ہم سوتے رہتے ہیں اور اندر ہی اندر وہ ننھا سا بیج درخت بنتا رہتا ہے۔'' آگے کی ڈور اب قریشہ کے ہاتھ میں تھی۔

''لیکن صرف مسلمانوں کو ہی اپنی سوچ میں تبدیلی کرنے کی نصیحت تم کیوں دے رہے ہو؟ یہ تو یکطرفہ بات ہوئی۔ یہ یکطرفہ مکالمہ بھی تو ایک طرح کا دوغلا پن ہے..... تم بھی تو رشید کے ماں باپ کی طرح ہی ہو۔ فرق صرف یہ ہے، وہ جاہل تھے اور تم پڑھے لکھے ہو۔''

''نہیں قریشہ..... یہ بات نہیں ہے۔ میں اپنے مسلم معاشرے کے ساتھ زیادہ رہا ہوں اس لئے اس سماج کی کمیاں، خامیاں مجھے معلوم ہے۔ اس لئے میں اشارے کر سکتا ہوں۔ سیکولر کا لفظ دونوں کے لئے استعمال کیا ہے میں نے..... لیکن سوچ میں تبدیلی کی بات مسلمانوں کے لئے..... کیوں.....؟ میں بتاتا ہوں..... وطن کو آزادی ملی تو کہیں نہ کہیں سے یہ عدم تحفظ کا جذبہ ہی تھا کہ ''میرا اپنا پاکستان'' کا نعرہ بلند ہوا۔ بسے بسائے لوگوں نے اپنا گھر بار چھوڑ کر پاکستان جانا

اس لئے بھی ضروری سمجھا کہ یہاں ان کی ذات کو خطرہ لاحق تھا ـــــ یہاں انہیں بڑے عہدے نہیں ملنے والے تھے۔ یہاں انہیں اپنے حق سے محروم کئے جانے کا ڈر تھا ـــــ اس لئے..... ہاں اسی لئے وہ پاکستان چلے گئے..... پاکستان، یعنی اسلامی ملک..... یہ بات غور کرنے کی ہے کہ پاکستان سے ایک اور ملک نکلا ـــــ بنگلہ دیش..... اسے بھی اسلامی ملک کہا گیا ـــــ اس لئے بی جے پی جیسی مذہبی پارٹیاں اگر یہ محسوس کرتی ہیں کہ بھارت ہندو راشٹر ہے تو مسلمانوں کو اس معاملے میں سوجھ بوجھ سے کام لینا چاہئے؟''

●●

افروز نے اسے غور سے دیکھا..... ''یعنی ہندو بن جانا چاہئے؟''

قریشہ طنز سے مسکرائی۔ ''یعنی بال ٹھاکرے جیسوں کے وجود کو تسلیم کر لینا چاہئے۔ جو کہتے ہیں مسلمان اس ملک کے لئے کینسر ہیں۔ مسجد میں اذان نہیں ہونی چاہئے۔ آر ایس ایس، بجرنگ دل جیسی سنستھاؤں کے آگے جھک کانا چاہئے۔''

''غلط..... انور نے تیزی سے بات کاٹی..... انتقامی جذبہ، نفرت کبھی اس مسئلے کا حل نہیں رہا۔ یہ مت بھولو کہ یہاں مسلمان میجریٹی میں نہیں ہیں ـــــ وہ اقلیت کہلاتے ہیں۔''

''بیس بائیس کروڑ کی آبادی اقلیت نہیں ہوتی۔''

''یہ شہاب الدین جیسوں کی گنتیاں کہتی ہیں ـــــ میں کسی پر مطلب پرست ہونے کا الزام نہیں لگا رہا۔ صرف یہ کہہ رہا ہوں کہ زمانہ خراب ہے تو اسے خراب کہہ کہہ کر خراب کیا گیا ہے۔ محبت سارے زخموں پر مرہم لگا سکتی ہے۔ میں اپنی قوم کے جن زیادہ تر لوگوں سے ملا ہوں، وہ مجھے کمیونل لگتے ہیں۔ ان کی باتوں سے فرقہ پرستی کی بو آتی ہے ـــــ ہمارے زیادہ تر اخبارات فرقہ واریت کو ہوا دے رہے ہیں..... میں نے پہلے بھی کہا ہے، میں اس مسلم سماج کو زیادہ قریب سے جانتا ہوں، اس لئے کہہ رہا ہوں کہ انہیں اپنی سوچ میں تبدیلی لانی ہوگی۔ خود کو غیر محفوظ سمجھنے کے کورے تصور کا خاتمہ کرنا ہوگا۔ ہم یہاں رہتے ہیں ـــــ یہاں کھاتے ہیں ـــــ اس لئے اپنے وطن کے لئے ایماندار ہیں۔ ہمیں اپنی ایمانداری ظاہر کرنے کے لئے ایسی باتیں کرنی ہوتی ہیں کہ گویا ہم تو دوسروں کے گھروں میں رہ رہے ہیں۔ اس خیال کا خاتمہ کرنا ہوگا۔''

قریشہ نے تالی بجائی۔ ''تقریر میں تو تم سے کوئی جیت نہیں سکتا بھائی جان! کل کے رضا کار آندولن اور مسلم لیگیوں کو اگر تم مل گئے ہوتے تو ہیرو بن جاتے!''

''آج کون سی کمی ہے صرف نام بدلا ہے۔ جماعتیں بدلی ہیں۔'' انور ایک پھیکی ہنسی ہنسا.....

قریشہ پھر ہنسی۔ گھر کا موچہ جیت جاؤ تو جانیں۔ مارکیٹ کمپلیکس بنے گا؟ وہ انور کی نقل اتارتے ہوئے بولی۔

انور اچانک پھر سے سنجیدہ ہو گیا۔ وہ اچانک افروز کی طرف مڑا۔

''افروز؟ تم اب اس گھر کے لئے غیر نہیں رہی۔ تم جان چکی ہو کہ دور سے نظر آنے والا یہ سونا درحقیقت سونا نہیں رہا ـــــ حویلی نیلام ہونے کے دن آ گئے ہیں۔ لے دے کر آباء واجداد کی یاد میں ایک گولا رہ گیا ہے۔ سبزی منڈی..... بس وہیں کا کرایہ آتا ہے۔ ابا تو کچھ کرتے ہی نہیں۔ تم ہی بتاؤ ایسے کیسے چلے گا۔ کچھ تو کرنا ہوگا، نا ـــــ؟''

''تم بات کرو گے ابا سے۔ قریشہ طنز سے بولی۔'' ''ہاں! بات کروں گی۔''

''وہ پھر دسترخوان سے اٹھ جائیں گے۔''

''ابا ہمارے زمانے کی مجبوری تو سمجھتے ہی نہیں، لیکن انہیں بتانا ضروری ہے۔''

قریشہ کی آنکھوں میں پھر سے نفرت کے دِیے جل اٹھے تھے۔

''تم تبدیلی کی بات کرتے ہو بھیا، نواب صاحب جیسے لوگ کہاں بدلے۔ وہ آج بھی خود کو نواب سمجھتے ہیں۔ حالی محالی، نوکر چاکر..... ہاتھی پیلوان نہ ہوئے تو کیا ہوا، حویلی تو ہے۔ پرکھوں کی شان ختم ہو گئی تو کیا ہوا۔ نوابی آن تو باقی ہے۔ یہی نوابی آن تو لے ڈوبی مسلمانوں کو۔ اسی آن اور شان نے تو تاج وتخت چھین لئے۔ محتاج اور ماتحت بنا دیا۔''

قریشہ کے لفظوں میں سانپ کی پھنکار شامل تھی۔

''گھر کی بیویوں کو یہ نواب رات کا کھلونا سمجھتے ہیں۔ کبھی کبھی وہ بھی نہیں۔ اور یہ نواب صاحب، میں نفرت کرتی ہوں۔ نفرت کرتی ہوں۔ آئی ہیٹ.....''

''قریشہ!'' انور زور سے چیخا۔

قریشہ بت بن گئی تھی۔ پھر وہ تیزی سے اندر بھاگ کھڑی ہوئی۔

انور نے سر کو جھٹکا دیا۔ ''تم برا مت ماننا افروز۔ میری بہن ابا سے سخت نفرت کرتی ہے۔ ابا نے امی کو کوئی خوشی نہیں دی۔ کہتے ہیں ایک کوٹھے والی تھی۔''

انور بولتے بولتے رک گیا۔

افروز کا سینہ دھک دھک کرنے لگا۔ انور سے نظریں ملانے کی اب اس میں تاب نہیں تھی۔

(15)

نواب الطاف حسین کمرے میں بے چینی سے ٹہل رہے تھے۔ گزرا ہوا کل جیسے سرگوشیاں کر رہا تھا۔ وقت بدل چکا ہے نواب صاحب..... تم اس نئے وقت کی آواز کیوں نہیں سن پا رہے ہو۔ لیکن نئے وقت یا بدلتے حالات کی ستم ظریفی ان کے چہرے پر لکھ دی گئی تھی۔ چہرہ آڑی ترچھی لکیروں سے بھرا ہوا۔ پرانی یادوں نے اچانک ان پر حملہ کر دیا تھا——

اندر کا آدمی جیسے اچانک ان کے سامنے کھڑا ہو گیا.....

وہ دن ختم ہو گئے الطاف حسین.....

ختم ہو گئے.....

پرانے دنوں کو اب بھول جاؤ الطاف حسین.....

بھول جاؤ.....

ذہن میں جیسے نگاڑے بج رہے تھے..... ڈھم..... ڈھم..... ڈھم..... حویلی کی رونق اور آب و تاب نوجوانی تک قائم تھی۔ فرنگیوں کی حکومت تھی تو نوابوں کے ٹھاٹ باٹ ہی نرالے تھے..... آزادی نے یہ سب اچھے دن چھین لئے۔ زندگی نے کیسے کیسے دن دکھائے تھے..... کوٹھی کی جھڑتی دیواروں اور بے رونق ہوتی محرابوں کو دیکھ رہے تھے۔

اور جیسے یہ جھڑتی دیواریں اور محرابیں ان سے محو گفتگو تھیں۔

''میاں الطاف حسین! وہ لوگ کہاں گم ہو گئے، جن پر ناز کیا کرتے تھے تم.....؟ فرنگیوں کی پھیکی ہوئی، چوسی گئی گٹھلیاں بھی کام نہیں آئیں تمہارے؟ اس نئی ہوا کا مقابلہ کیسے کرو گے؟ لوگ جان چکے ہیں کہ اب اس 'شاہانہ جسم' میں اُلجھنوں اور فکر کے ہزاروں پیوند لگ چکے

ہیں..... سب کچھ جیسے نیلام ہونے کو آ گیا ہے۔ تمہیں احساس ہے الطاف حسین؟

اپنے لڑکوں سے ملے ہو کبھی—— آمنے سامنے بیٹھ کر گفتگو کی ہے؟ آنکھوں میں جھانکا ہے؟ نفرت کے شعلوں کی 'جھانس' محسوس کی ہے کبھی.....؟

اب اس بے خودی کے مصنوعی لبادہ کو اتار پھینکو الطاف حسین.....

الٰہی..... جیسے اپنے کپڑوں سے بو اٹھتی محسوس ہوتی..... انہیں لگتا ہے، وہ باہر نکلتے ہیں اور لوگ ان کی ختم ہوتی نوابی شان کا مذاق اڑاتے ہیں..... دیکھو وہ جا رہا ہے، بگڑا نواب، پھوٹی کوڑی کا محتاج..... ارے میاں ہاتھی بھی مر گیا، رسّی بھی جل گئی۔ اب صرف جھوٹی نوابی شان رہ گئی ہے اور اسی کو ڈھو رہے ہیں نواب الطاف حسین۔

●●

وہ جیسے پسینے پسینے ہو گئے۔ چونکے اس وقت، جب پاس آ کر ثمینہ بیگم کھڑی ہو گئیں۔

خیالوں، خوابوں کی دنیا سے باہر نکل کر نواب صاحب نے دیکھا..... ان جانی پہچانی آنکھوں میں بھی، اسی نفرت کے دھدھکتے شعلے تھے، جو اب بدلتے حالات کے ساتھ ان کا مقدر بنتے جا رہے تھے۔

ثمینہ بیگم نے آگے بڑھ کر پان کا طشت بڑھایا۔ پھر آہستہ سے بولیں۔

''برا نہ مانئے تو ایک بات کہوں۔ پان اب کم کر دیجئے نواب صاحب مہنگے ہو گئے ہیں۔''

''مہنگے ہو گئے ہیں؟''

نواب صاحب ایک دم سے چونک گئے..... جیسے اس الفاظ کی 'ذلت' پر غور کر رہے ہوں۔ اندر کی کشمکش نے ان کا بلڈ پریشر ہائی کر دیا تھا۔

''کیا کیا کم کروں بیگم صاحبہ۔ کیا کیا کم کروں۔ اب کہو گی ایک وقت کا کھانا کم کر دیجئے، گرانی آ گئی ہے۔''

''وہ دن بھی آ سکتے ہیں نواب صاحب.....''

ہمیشہ چپ رہنے والی امی جان کو آج جانے کہاں سے زبان مل گئی تھی۔

''تو کیا؟''

نواب صاحب غصّے سے تھر تھر کانپنے لگے۔

''تم کیا جانو ہماری شان وشوکت بیگم صاحبہ۔ وہ لفظ ہی نہیں ہیں ہمارے پاس کہ اس سنہرے دور کو لفظوں میں اتار سکوں۔ ہم ہمیشہ دینے والے ہاتھ رہے ہیں۔ نواب عاشق حسین کی حویلی تھی یہ، جہاں سے کبھی کوئی خالی ہاتھ نہیں گیا اور آج نواب آصف حسین کے وارثوں کے نصیب میں یہ دن دیکھنا لکھا ہوا ہے کہ ان سے کہا جا رہا ہے، پان کم کر دیجئے نواب صاحب، مہنگے ہو گئے ہیں۔''

ثمینہ بیگم نے غور سے نواب صاحب کا چہرہ دیکھا۔ آج برسوں بعد جیسے ان کے صبر کا باندھ پوری طرح ٹوٹ گیا۔

وہ زور سے دہاڑیں..... ''جب نو من تیل تھا تب رادھا بھی ناچتی تھی نواب صاحب..... آپ ہیں کہاں، آج نہ نو من تیل ہے نہ رادھا ناچے گی۔ کل دینے والے ہاتھ تھے تو گھر بھی چیزوں سے بھرا تھا۔ آج مانگنے والوں کو کیا دیں گے آپ؟ بنیے، دودھ والوں کا ادھار چڑھتا ہے تو گولہ سے آئی آمدنی کا انتظار کرنا پڑتا ہے..... کہئے جھوٹ بولتی ہوں میں۔ آپ کے ہاتھوں کو کبھی یہ بھی توفیق ہوئی کہ میرے واسطے دو کانچ کی چوڑیاں ہی لے آتے۔ بیوی ہونے کا بھی کون سا حق دیا ہے آپ نے۔ دادا پردادا کی بچی کھچی جاگیریں نہ ہوتیں تو آج پورا خاندان سڑکوں پر بھیک مانگ رہا ہوتا..... بولئے جھوٹ بولتی ہوں میں؟ جواب دیجئے نواب صاحب.....''

نواب صاحب جیسے چانک غصّے میں بھر گئے۔ کہتے کیا..... ثمینہ بیگم کی باتوں میں جھوٹ ہی کیا تھا۔ بولتے بولتے ثمینہ بیگم کی آواز بھاری ہو گئی تھی۔ آنکھوں میں امڈتے آنسو کے قطرے کو بڑی مشکل سے ضبط کیا۔

پھر تیزی سے کمرے سے باہر نکل گئیں۔

نواب صاحب، حیرت زدہ خالی دروازہ کو گھور رہے تھے۔

(16)

قریشہ کالج سے لوٹی تو اس کا پارہ چڑھا ہوا تھا۔ وہ فرسٹ ائیر میں تھی۔ کمرہ میں لوٹی تو انور کتابوں میں کچھ تلاش کر رہا تھا۔ قریشہ نے کتابیں اتنی زور سے پٹکیں کہ انور ایک دم سے چونک گیا۔

''بات کیا ہے قریشہ؟''

قریشہ کے قدموں کی مانوس آہٹ پہچان کر افروز بھی چلی آئی_____

قریشہ زور سے بولی..... ''یہ ملک اب رہنے کے لائق نہیں ہے۔''

''ہوا کیا؟''

''میں پوچھتی ہوں کتنے لوگ ہیں ایسے..... مٹھی بھر..... مٹھی بھر، نا؟..... پھر مٹھی بھر لوگوں کا الزام پوری قوم پر کیوں عائد ہوتا ہے۔''

''تم پہلیاں بجھاؤ گی یا کچھ کہو گی بھی۔''

''سمجھ میں نہیں آتا..... کیا کہوں..... کیسے کہوں..... میری ایک سہیلی ہے..... ونیتا..... آج میرا اس سے جھگڑا ہو گیا..... وہ کہتی ہے کرکٹ میں جب پاکستان جیتتا ہے تب تم خوش ہوتے ہو۔ مسلمان کو ہندوستان سے زیادہ پیار پاکستان سے ہے۔ پاکستان کے ہارنے پر غم منایا جاتا ہے اور جیت کی خوشی میں پٹاخے چھوڑے جاتے ہیں۔''

''پاکستان سے ہماری محبت ہو سکتی ہے۔ اس کی ایک وجہ تو یہ ہے کہ وہاں ہم میں سے، بہت سے لوگوں کے عزیز اور رشتہ دار رہتے ہیں۔ دوسرے پڑوسی ملکوں کی طرح وہ بھی ہمارا پڑوسی ملک ہے، لیکن جہاں وہ مسلمان تنگ نظر ہیں جو ایسے مٹھی بھر لوگوں کو ہندوستان کے تمام مسلمانوں

کی آواز سمجھتے ہیں، وہیں وہ ہندو بھی قصوروار ہیں جو چند لوگوں کا الزام پوری مسلمان قوم پر ڈال دیتے ہیں۔

انور معصومیت سے بولا۔ ''اس میں اس قدر ناراض ہونے کی کیا بات ہے قریشہ۔ چند غلط لوگ اِدھر بھی ہیں اُدھر بھی۔ ہندوستان جیتتا ہے تو تم کس قدر ایکسائٹڈ ہوتی ہو..... ہوتی ہو کہ نہیں؟''

''ہوتی ہوں..... مگر ایسا سوچنے والے؟''

''یہی لوگ تو قطرہ قطرہ بڑھ کر ایک سرکش جماعت میں تبدیل ہو جاتے ہیں۔ ملک میں ہونے والے خون خرابے کے ذمہ دار یہی لوگ ہیں..... کیوں افروز..... تمہارا کیا خیال ہے؟''

''میں کیا جانوں.....'' افروز دھیرے سے مسکرائی۔ ''آپ لوگ جو باتیں کرتے ہیں وہ میری سمجھ میں نہیں آتی..... مگر سوچتی ہوں آپ کی باتوں میں دم ہے۔ یہی ہونا چاہئے۔''

بہت دیر بعد افروز نے اس بحث میں حصہ لیا تھا۔

صحیح بات یا فیصلہ کی کمی کے باعث کوئی غلط بات ذہن پر بیٹھتی چلی جاتی ہے..... جیسے طوائف.....''

اچانک وہ ٹھہر گئی۔ قریشہ اور انور حیرت سے اسے دیکھنے لگے۔ لیکن افروز کے چہرے پر عجیب سی سنجیدگی پھیلی ہوئی تھی۔

''کوئی طوائف اگر کسی مجبوری سے اس پیشے میں آ گئی ہے ـــــ تو ایک بار کے بعد وہ اس دلدل میں پھنستی ہی چلی جاتی ہے..... اس لئے کہ تب اسے یہ سمجھانے والا کوئی نہیں ہوتا کہ اس دلدل کی کوئی حد نہیں ہے..... اور یہ کہ..... صبح کے بھولے کو، شام کو گھر واپس آنے کے لئے بھی، عمر کی کوئی قید مقرر نہیں ہے۔ طوائف یہی بات نہیں سوچ پاتی..... اور وہ گندہ ذہن رکھنے والے مسلمان بھی..... اور وہ ہندو بھی..... جو سب کو ایک ترازو میں تولتے ہیں۔''

افروز کو اچانک لگا..... وہ کچھ زیادہ ہی بول گئی ہے..... اس نے ہتھیلیوں سے منہ چھپا لیا۔

انور اور قریشہ نے، اس کے چپ ہوتے ہی زور سے تالیاں بجائیں۔

قریشہ بولی..... ''میں سمجھتی تھی کہ میری بنو کے منہ میں زبان ہی نہیں ہے۔''

انور کو بھی حیرت تھی۔ ''تم بالکل ہمارے ہی خیال کی ہو افروز۔''

افروز دوبارہ مسکرائی..... ''صحیح اور غلط خیال کیا ہے بھائی جان.....؟ سب سے بڑی چیز تو انسانیت ہے۔''

بولنے کو اتنا تو بول گئی افروز لیکن اندر ہی اندر وہ ڈر بھی رہی تھی۔ کہیں قریشہ اور انور حقیقت نہ سمجھ جائیں کہ وہ..... کون ہے..... نواب صاحب کی ناجائز اولاد۔

●●

اس بیچ شہر کا ماحول تھوڑا سا ٹھیک ہوا تھا..... سلمان میاں کی گرفتاری کے بعد بھی ان کے لوگوں نے کافی ہنگامے کئے تھے۔ شہر میں بدامنی پھیلانے کے ذمہ دار بھی وہی تھے۔ جلوس بھی ان کی ہی قیادت میں نکلا تھا۔ پتھراؤ اور ہنگامے کیے بعد وہ کہیں روپوش ہو گئے تھے۔ لیکن پولیس جب قرقی ضبطی کو آئی تو انہیں ہتھیار ڈالنے پڑے..... سلمان میاں کی گرفتاری کو لے کر کافی ہلّہ غلّہ مچا ـــــ لیکن پولیس فورس اور انتظامیہ نے دوبارہ ہونے والے دنگوں کی ساری کوششوں کو ناکام بنا دیا تھا۔

ماحول اب کچھ کچھ ٹھیک تھا۔

افروز نواب خاندان کے کھوکھلے پن اور مرے ہوئے ہاتھی کی حقیقت جان چکی تھی۔ وہ وقت کے انتظار میں تھی کہ کب نواب صاحب خالی ہوں اور وہ ان سے اپنے واپس جانے کی بات کرے۔

مگر نواب صاحب کی تو دنیا ہی مختلف تھی۔ بائی اماں کے گزر جانے کے بعد، اب ان کی باہری مصروفیت بھی تقریباً بند ہو چکی تھی..... دن بھر کمرے میں پڑے رہتے۔ کسی سے کچھ بولتے نہ سنتے۔ ایک انور ہی تھا جو لے دے کر نئی گفتگو لے کر بیٹھ جاتا۔ لیکن نواب صاحب ہمیشہ ہی ایسی گفتگوؤں سے کنّی کاٹنے کی کوشش کرتے۔

●●

شام کے وقت گولہ سے اسحاق سبزی والے کا چھوٹا بھائی بھولو آیا تھا۔ بھولو کے بارے میں مشہور تھا کہ وہ کئی قتل کر چکا ہے۔ چہرے سے بھی وہ بدمعاش دکھتا تھا۔ بھولو نے مہینے کے پیسے انور کے ہاتھوں میں تھمائے پھر کڑک کر بولا۔

''انور بابو.....سب حساب کتاب برابر.....''

''مطلب.....''

انور ایک دم سے چونک پڑا۔

بھولو تیوریاں چڑھا کر بولا۔''مطلب ای کہ ہمارا گھاٹا جا رہا ہے۔ہم نواب صاحب کو اب ٹیکس نہیں دیں گے۔جو کرنا ہے کرلیں.....ہم بھی تیار ہیں۔''

بھولو نے آنکھیں دکھائیں اور دندناتا ہوا چلا گیا۔انور غصّے میں، مٹھیوں میں روپے دابے اندر آیا۔اتفاق سے اس وقت دالان میں سب لوگ جمع تھے اور شام کی چائے پی رہے تھے۔

امی جان نے غصّے میں بھرے ہوئے انور کو دیکھا تو ماتھا ٹھنکا۔

''کیا بات ہے انور؟''

''بھولو پیسے دے کر گیا ہے۔آئندہ ماہ سے پیسے نہیں دے گا۔''

''کیا مطلب؟''نواب صاحب کی چائے اُچھل کر ان کی چمچماتی شیروانی پر گری تھی۔

''مطلب یہ کہ یہ تو صرف ایک شروعات ہے ابا حضور۔بھولو دوسرے سے کہے گا۔ دوسرا تیسرا سے۔پھر گولہ سے ہونے والی آمدنی کا واحد ذریعہ بھی بند ہو جائے گا۔پھر کہاں سے کھائیں گے آپ؟ حویلی کو کتنے دنوں تک جائیں گے۔''

''حویلی.....حویلی.....''

غصّہ سے بھرے ہوئے نواب صاحب نے شیشے کی قلفی طشتری دیوار پر دے ماری۔یہ جنون کا انداز پہلی بار دیکھا تھا افروز نے ـــــ نواب صاحب غصّے میں کانپ رہے تھے۔

''بیچ دو حویلی۔ننگے ہو جاؤ ـــــ جہنم میں جاؤ۔''

اور سب کو حیرت زدہ چھوڑ کر وہ تیزی سے آگے بڑھ گئے۔

(17)

افروز کو رات بھر نیند نہیں آئی۔

آج اس نے نواب صاحب کا عجیب وغریب چہرہ دیکھا تھا۔اس چہرے کے بارے میں تو اس نے کچھ سوچا بھی نہیں تھا۔اس ماحول میں تو وہ رہ ہی نہیں سکتی تھی۔یہ سب کیا ہے؟ باہر رہ کر تو وہ ان کے بارے میں کیا کیا سوچتی آئی تھی اور اندر سے حقیقت کیا تھی۔وہ یہ گھر چھوڑ دے گی اور راجدھانی نکل جائے گی۔

افروز کا یہ آخری فیصلہ تھا۔

اس دن وہ صبح سویرے ہی اٹھ گئی۔پہلا کام یہ کیا کہ باورچی خانے میں جا کر سب کے لئے چائے بنا ڈالی۔ابھی سب سو رہے تھے۔نواب صاحب کے کمرے سے کھٹر پٹر کی آواز آ گئی تھی۔یعنی وہ جاگ رہے تھے۔افروز کو سیدھی سادی امی جان سے جھوٹ بولتے ہوئے گناہ کا احساس ہوا تھا۔اس نے سوچ لیا تھا کہ وہ امی جان کو سچ سچ بتا دے گی۔

وہ کون ہے.....؟

کہاں سے آئی ہے.....؟

اس کی اصلیت کیا ہے.....؟

وہ جو بھی ہے،اس میں خود اس کا کیا قصور.....؟

قریشہ،انور اور امی جان کو چائے پہنچانے کے بعد نواب صاحب کے کمرے میں پہنچی۔ نواب صاحب اس وقت اپنی خاندانی شمشیر لئے ہوئے تھے۔شمشیر کو زنگ کھا گئی تھی۔وہ اسے ہلا ڈلا کر، چھو کر دیکھ رہے تھے۔اس کی آہٹ سن کر نواب صاحب نے نظریں اٹھائیں۔

''چائے.....'' وہ آہستہ سے بولی۔

''رکھ دو۔''

شمشیر کافی وزنی تھی۔ اس کی دھار اب کند ہو چکی تھی۔ وہ یونہی کھڑی رہی۔ نواب صاحب نے پھر سر اٹھایا۔

''تم گئی نہیں.....؟''

''میں..... کچھ کہنے آئی تھی۔'' افروز نے ہمت سے کام لیا۔

''کیا ہے.....؟'' نواب صاحب ابھی ابھی شمشیر سے کھیل رہے تھے۔

''میں..... جانا چاہتی ہوں..... آپ نے کہا تھا۔''

''ہاں..... پتہ کے بارے میں..... وہاں، پرانی دلّی میں میرے ایک دوست مولوی عنایت اللہ رہتے ہیں..... خاندانی آدمی ہیں۔ وہ تمہارا کوئی نہ کوئی انتظام کر دیں گے۔''

''شکریہ.....''

نواب صاحب نے کوئی جواب نہیں دیا۔ وہ کچھ دیر تک بے خیالی میں یونہی کھڑی رہی۔ پتہ نہیں، کس جذبہ کے تحت اس کی آنکھیں نم ہو گئیں ـــــ پھر وہ تیزی سے کمرے کے باہر نکل گئی۔

●●

امی جان پرانے کپڑوں کی گانٹھیں کھول رہی تھیں۔ افروز آہستہ آہستہ چل کر امی جان کے قریب کھڑی ہو گئی۔

''میں جا رہی ہوں امی جان۔''

اچانک..... امی جان کے ہاتھ ٹھہر گئے۔ چہرے پر لرزہ طاری ہوا۔

''کیا کہتی ہو..... افروز۔''

یہ وہی پیار اور اپنا پن کے بول تھے، جسے سننے کے لئے وہ کچھ دیر کے لئے نواب صاحب کے پاس ٹھہری تھی۔

''میں آج چلی جاؤں گی۔''

''تم بھی اس گھر کی فرد ہو افروز.....''

''نہیں امی۔ میں نے آپ سے سچ چھپایا تھا۔''

افروز کی آنکھوں میں آنسو کے قطرے تیر رہے تھے ـــــ ''میں وہ نہیں ہوں امی جو آپ سمجھتی ہیں۔''

اور اچانک وہ ہوا کہ وہ تصور بھی نہ کر سکی ـــــ امی نے اپنی شفقت کا خزانہ کھول دیا۔ پیار سے بانہوں میں لپٹا لیا.....

''میں جانتی ہو تم کون ہو بیٹی..... کیا محض اتنا کہہ دینا کافی نہیں ہے۔''

''امی.....'' وہ پتھر کے بت کی طرح امی کو دیکھتی رہ گئی..... ''آپ.....؟''

''مجھے تو اسی دن سے پتہ تھا پگلی..... نواب صاحب لوگوں میں گناہ کرنے کی تو ہمت ہوتی ہے مگر سچ بولنے کی نہیں۔ تم اس خاندان کی چشم و چراغ ہو افروز..... تم کہیں نہیں جاؤ گی۔''

''امی!'' اس کے لفظ تھرتھرا گئے۔ ''میرا جانا ضروری ہے امی جان۔ ورنہ میں بہت ٹوٹ جاؤں گی۔ مجھے صدقے کی زندگی نہیں جینی امی جان۔ میں اپنی زندگی جینا چاہتی ہوں۔ میں دیکھنا چاہتی ہوں کہ میں..... کچھ کر سکنے کے قابل ہوں یا نہیں۔''

''تم جاؤ گی افروز اور ضرور جاؤ گی۔''

دروازے پر آنکھوں میں آنسو لئے انور کھڑا تھا۔

اس کے پیچھے حیرت زدہ قریشہ کھڑی تھی۔

قریشہ نے اسے گلے لگا لیا۔ ''کرنے کو تو یہاں بھی بہت کچھ ہے افروز..... لیکن تمہاری خواہش ہے تو ضرور جاؤ۔ لیکن وعدہ کرو کہ تم ان رشتوں کو قائم رکھو گی.....''

''وعدہ.....''

ہنستے ہنستے اچانک افروز رو پڑی تھی.....

اور اس کے ٹھیک دو دن بعد وہ دلی کے لئے روانہ ہو گئی.....

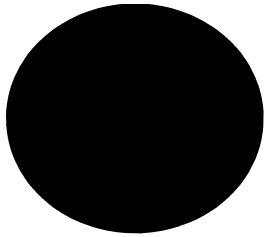

دلّی

(1)

مولوی عنایت اللہ کے گھر کا باہری کمرہ اس وقت زیادہ تر داڑھی والے لوگوں سے بھرا ہوا تھا۔

دوپہر کی تپش اپنے شباب پر تھی۔ یہ پرانی دلّی کا علاقہ تھا۔ پرانی دلی، جدھر سے بھی گزریے، یہ خیال آتا تھا، کہ کیا یہ وہی دلی ہے، جسے مغل بادشاہوں نے سر آنکھوں پر بٹھا رکھا تھا۔ جس کے بارے میں کیسی کیسی داستانیں مشہور تھیں..... پرانی دلی، جس کے تصور سے ہی دلی کی پرانی رونق اور کہانیاں یاد آجاتیں.....میاں، یہ وہ دلی نہیں ہے ـــــ دلّی تو لٹ گئی۔ کب کی برباد ہو چکی ہے.....کیسی کیسی کہانیاں ـــــ تہذیب تو کبھی یہاں کھیلی تھی ـــــ پلی بڑھی تھی ـــــ سجی ہوئی دکانیں، شاہی خاندانوں کی گزرتی سواریاں.....کہیں کسی موڑ سے ابھرتی ہوئی تیز صدا.....

باادب باملاحظہ ہوشیار.....

بادشاہ سلامت کی سواری آرہی ہے.....

پردہ کر لیجیئو۔ بیگمات گزر رہی ہیں.....

لیکن یہ وہ دلی کہاں تھی..... یہاں تو گندگی کے ڈھیر لگے تھے۔ بے ہنگم شور سے کان کے پردے پھٹے جا رہے تھے۔ گوشت اور مچھلیوں کی سڑانڈ.....فضا میں چاروں طرف پھیلی ہوئی بدبو.....ناک پر رومال رکھے بغیر دو قدم بھی چلنا محال تھا.....

یہ وہ دلی کہاں تھی؟

تہذیب کا مرکز.....؟

''کیا بود و باش پوچھو ہو پورب کے ساکنو!
ہم کو غریب جان کے ہنس ہنس پکار کے
دلی جو ایک شہر تھا عالم میں انتخاب
رہتے تھے منتخب ہی جہاں روزگار کے
جس کو فلک نے لوٹ کے برباد کر دیا
ہم رہنے والے ہیں اسی اجڑے دیار کے
.....غالب کی دلی
.....داغ کی دلی

.....وہ دلی تو کہیں کتابوں میں گم ہوگئی تھی۔ یہاں تو گندگی تھی۔ گندی گلیاں تھیں..... گندے گندے لوگ۔ تجارتی لوگ..... اَن پڑھ گنوار..... اور آج تجارت بھی کہاں رہ گئی تھی ـــــ وہ سب کچھ کہیں، کسی تاریخ کے مقبرے میں دفن ہو گیا لگتا تھا.....

وقت بدل گیا تھا۔ دلّی بدل گئی تھی۔ بادشاہوں والی دہلی..... پرانی دلی.....

●●

مولوی عنایت اللہ کا مکان.....

اب بارہ دری، دیوانِ خاص، دیوانِ عام جیسی چیزیں کہاں رہ گئی تھیں۔ درگاہ پر کی حویلی، اب مولوی عنایت کا مکان تھا اور کون مولوی عنایت؟ ارے وہی، جن کے لڑکے کی صدر، میں دو دکانیں ہیں۔ دکانوں والے.....اور مولوی صاحب.....ذرا باہر تو آئیو.....اُف، وقت کتنا بدل گیا.....

وہ نوابی شان کہاں..... وہ زبان کہاں..... وہ درباری زبان..... اردوئے معلیٰ کہاں.....مولوی عنایت کے لڑکے تو تجارتی زبان جانتے ہیں اور اسی زبان میں باتیں کرتے ہیں.....

پرانے دنوں کی یاد میں اکثر گم ہو جایا کرتے تھے مولوی عنایت.....تب ایک درد بھری صدا دل کے اندر سے پھوٹتی.....

وہ صورتیں الٰہی کس دیس بستیاں ہیں

اب دیکھنے کو جن کے آنکھیں ترستیاں ہیں

●●

سب کہاں کچھ لالہ و گل میں نمایاں ہو گئیں
خاک میں کیا صورتیں ہوں گی کہ پنہاں ہو گئیں

پرانی یادیں شب خون مارتیں تو ہمیشہ کی طرح ایک سخن تکیہ ان کی زبان پر چڑھ جاتا..... رومالی روٹی گئی۔ سادی چپاتی آ گئی.....

وہ چڑ چڑے بھی ہو گئے تھے..... بدن سے لحیم شحیم.....زیادہ تر گھر میں ہی رہتے۔ سفید لباس ان کا پسندیدہ لباس۔ سر پر ایک گول سی ٹوپی تھی۔ اب تو ماشاءاللہ داڑھی بھی برھالی تھی..... کیا پتہ، کب کس بات پر ناراض ہو جائیں.....غصّہ تو مکھی کی طرح ناک پر بیٹھا ہوتا۔

اس دن اچانک بیٹھے بٹھائے، پڑوس کے نظیر بھائی کے لڑکے پر بگڑ گئے۔ بات کھانے سے شروع ہوئی تھی اور کہاں جا کر ختم ہوئی.....

زیادہ گرم ہو جاتے تو ناک سے بولتے تھے مولوی عنایت اللہ۔

''تم کیا جانوں میاں منہ کے ذائقے۔ رومالی روٹی گئی سادی چپاتی آ گئی۔ میاں فخروں یا غالب کے زمانے میں ہوتے تو دیکھتے کہ گدا گر بھی کس ادب سے گدا لیا کرتے تھے۔ زبان کو تو میاں یہاں کی پنجابی اور ہریانوی نے مل کر خراب کر دیا.....ہم تو اپنے وقت میں بڑے بزرگوں سے آنکھیں تک ملانے کی تاب نہیں رکھتے تھے۔ سارا قصور تو بس مسلمانوں کا ہے میاں.....عیش میں سب کچھ ختم کر ڈالا ں۔ لٹا دیاں.....سب کچھ لٹاں کے ہوش میں آئے تو کیا ہواں.....رئیسی اور جاگیریں تو ایک طرف میاں، افسوس تو اس بات کا ہے کہ بچوں نے بچی کھچی تہذیب بھی مٹا دی.....ہے.....ہے.....

آب و روغن چڑھا کے دیکھ لیا
تم کو بھی آزما کے دیکھ لیا

●●

اور ایک تھے نظیر میاں، میاں مولوی عنایت اللہ کے پڑوسی۔ اگر اتفاق سے وہ بھی آ جاتے تو ان کی الگ ڈفلی، الگ راگ شروع ہو جاتا۔ نظیر میاں کو پاکستان سے نفرت تھی۔ تقسیم

کے بعد ان کے اکلوتے بہن بھائی پاکستان جا کر ہی بس گئے تھے۔ تب سے وطن آنا نصیب نہ ہوا۔ کہتے ہیں وہاں کی، ان کی مصروفیت ہی ایسی ہے کہ وقت نہیں ملتا ـــــــ وہ تو برا ہو بیٹوں کا، کہ ایک بار پاکستان کا ویزہ بنوا ڈالا اور بڑے میاں پاکستان سے ہو آئے ـــــــ گئے تھے تین ماہ کے لئے۔ لوٹ آئے ایک ہی ماہ میں۔ اب وہ ہیں اور گالیاں ہیں..... نظیر میاں کی پورے محلے میں اکیلے مولوی عنایت اللہ ہی سے پٹتی ہے۔ غلطی سے کسی تیسرے آدمی نے پاکستان کا ذکر چھیڑ دیا تو جیسے قیامت آ جاتی۔ پھر تو میاں نظیر کا غصّہ دیکھنے کے لائق ہوتا۔ طریقے طریقے سے منہ بنائے جاتے۔ گالیوں کے باندھ ٹوٹ جاتے۔ اوں..... لے کے رہیں گے پاکستان..... لے کے رہیں گے پاکستان..... میاں لے لیا نا..... چین مل گیا نا؟ قرار آ گیا نا دل کو..... نہیں نہیں..... وہاں اپنے لوگ ہوں گے..... مجھے تو اس قائداعظم پر غصّہ آتا ہے۔ بڑا آیا قائداعظم کہیں کا..... ملک کا بٹوارہ کرا دیا..... ہے ہے..... دلوں کی تقسیم کرا دی..... آدھے رشتے دار ادھر رہ گئے۔ آدھے ادھر چلے گئے۔ پھر کم بخت دوری بھی ایسی کہ دوبارہ ملنا نصیب نہ ہوا..... لے کے رہیں گے پاکستان..... لے لیا نا، جی ٹھنڈا ہو گیا نا..... اب چین کی بنسی بجا رہے ہیں نا..... وہ بلوچی ہے..... وہ پٹھان ہے..... وہ سندھی ہے..... وہ اردو بولتا ہے..... وہ بہاری ہے۔ وہ مہاجر ہے..... مار کاٹ مچی ہے۔ پٹھان کوٹ میں، زمین میں نشیلی چیزیں چھپائی جا رہی ہیں۔ ارے میاں..... گھر میں ٹھونسنے کے لئے دو وقت کی روٹی نہیں لیکن زمین پر شاندار کارپیٹ بچھائیں گے۔ پڑوسی کا 'ہکا' کریں گے۔ وی سی پی لیں گے۔ وی سی آر لیں گے اور چہرے پر پاؤ پاؤ بھر پاؤڈر کریم ملیں گے..... لڑکیاں..... ارے ہائے توبہ۔ جہنم میں جائیں۔ بڑا آیا اسلامی ملک۔ پردہ تو بس نام کا ہے..... کیوں عنایت اللہ..... میں نے غلط کہا کیا؟ غلط کہا تو سو جوتی میرے منہ پر بھگا کر مارنا..... کیوں؟

نہیں..... ہیں..... ہیں..... مولوی عنایت اللہ اپنا راگ لے کر بیٹھ جاتے..... رومالیں روٹیں گئیں..... سادی چپاتیں آ گئیں..... ہیں..... ہیں کساں نازک زمانہ ہیں..... پتہ نہیں مسلمانوں کو عقل کب آئیں گیں.....''

مولوی نظیر کو اس بات کا بھی ملال تھا کہ اب وہاں یعنی پاکستان میں لوگوں کے پاس محض دکھاوا رہ گیا ہے۔ نمائش رہ گئی ہے۔ خود ان کے اپنے بھائی ہیں۔ برسوں بعد جن سے ملنے۔ وہ پاکستان گئے تھے..... وہاں برسوں کی جدائی کا درد کیا ہوتا۔ بلکہ سوال پوچھتی مول تول کرتی

آنکھیں تھیں..... کہ بھیّا یہ کیا حال بنا رکھا ہے آپ نے؟ کیا بھارت میں مسلمانوں کی اقتصادی حالت ٹھیک نہیں۔ اس کا مطلب یہاں کے اخبارات ٹھیک ہی لکھتے ہیں..... آپ کرتے کیا ہیں۔ بچے کیا کرتے ہیں..... ہمارا؟ ہمارا تو بڑا لڑکا لندن میں ہے۔ دوسرا کویت میں..... لڑکی پیرس میں.....

آنکھوں میں حقارت ہی حقارت تھی۔

نفرت ہی نفرت تھی.....

اور صرف اعتراضات بھرے بول..... کہ بھارت کتنا بدل گیا..... وہاں رہنے والے مسلمانوں کو بھی سلیقہ نہیں..... ہنر نہیں..... گھر کی سجاوٹ انہیں نہیں آتی..... لباس اور مینٹینس سے انہیں دور کا واسطہ نہیں.....

یہ مولوی نظیر کے بھائی بہن تھے۔ کوئی غیر نہیں تھے۔ سوال پوچھنے والی آنکھوں میں مانوس چمک نہیں تھی۔ نظیر میاں ایک دم سے چونک گئے۔ وہ صرف ان الزامات کو سنتے رہے۔ کیا کہتے..... کہ بھائی..... تم سب جگہ ہو۔ پیرس میں..... لندن میں..... کویت میں..... لیکن پاکستان میں کب ہو.....؟ اپنے وطن میں کب ہو..... ہم تو اپنے وطن میں ہیں بھائی..... ہاں ہمیں سجاوٹ نہیں آتی..... رہنے کا طریقہ نہیں معلوم، لیکن اس خود نمائی کی رسم میں، ہم گھر کا سکون نہیں بیچتے..... تمہاری طرح دو جون کھا کر بھوکوں نہیں رہتے۔ ہمیں سجاوٹ نہیں آتی، اس لئے کہ ہم اپنے ڈرائنگ روم کو لندن اور پیرس کے سامانوں سے نہیں بھرتے..... ہم ہندوستانی ہیں۔ دل ہندوستانی ہے۔

اور.....

انہوں نے نظریں جھکا لیں..... ارادہ باندھ لیا..... یہاں نہیں رہیں گے اور اب کبھی نہیں آئیں گے۔

کہتے ہیں مولوی نظیر جب پاکستان سے لوٹے تو کچھ دنوں تک لوگوں سے منہ چھپاتے پھرتے رہے۔ انہیں شرم آتی ہے کہ وہ لوگوں سے پاکستان کے بارے میں کیا کہیں گے۔ جھوٹ وہ بول نہیں سکتے..... اور وہ پاکستان کے بارے میں کیا کہیں گے جہاں آزادی کے اتنے سالوں بعد بھی ان کے بھائی مہاجر جیسی گالیاں سن رہے ہوں اور لندن پیرس کی تعریف میں ڈوبے ہوں۔ تف ہے ایسی عزیت پر کہ بسنے کے اتنے دنوں بعد بھی مہاجر کہلا رہے ہیں..... میاں نظیر اور مولوی

عنایت اللہ جیسے لوگ اس محلے میں کم نہیں تھے جنہیں اس بات کا شدت سے احساس تھا کہ وقت بدل گیا اور اب اس عہد کی رنگینی واپس نہیں آسکتی۔

●●

دور سچ مچ نازک آ گیا تھا۔ اس معاملے میں پرانی دلی کا یہ علاقہ بہت نازک مانا جاتا تھا۔ ذرا سی بات پر دو فرقوں میں ٹھن جاتی..... دکانیں بند ہو جاتیں۔ کبھی کبھی شاہی مسجد سے بھی خطبہ کی جگہ سیاسی فرمان جاری ہو جاتے.....

کہ اے مسلمانو! تم یہ کرو..... تم وہ کرو.....

آن میں پولیس فورس وال سیٹی کو اپنے گھیرے میں لے لیتی..... کرفیو لگ جاتا.....

یہ ہر معاملے میں Sensitive ایریا تھا۔ جب بھی کوئی ایسی ویسی بات ہوتی، مولوی عنایت اللہ کا گھر سیاست کا اکھاڑہ بن جاتا..... محلے کے مسلمانوں کی وہیں میٹنگ ہوتی۔ مشورے ہوتے..... بچاؤ کی راہیں نکالی جاتیں.....

●●

دوپہر کی تپش سے زمین سلگ رہی تھی.....

مولوی عنایت کے یہاں بہت سے داڑھی والے جمع ہو چکے تھے۔ سب شہر کی خراب ہوئی فضا کو لے کر فکر مند تھے۔ ایک ادھیڑ عمر کے آدمی نے اپنے شک کا اظہار کیا۔

—— ''بی جے پی سے ہی ہمیں سب سے بڑا خطرہ ہے۔''

—— ''وہ مسلمانوں میں پھوٹ ڈلوانا چاہتی ہے۔''

ایک شخص نے اپنی رائے پیش کی۔

—— بی جے پی کا چناؤ نشان رد ہونا چاہئے۔

—— ''اس لئے کہ اس پر مذہب کا لیبل لگا ہے۔''

—— ''ملک کے حالیہ دنگوں سے بھی یہ بات ظاہر ہو چکی ہے۔''

—— ''لیکن یہ بھی تو طے ہو کہ ہم کس کے ساتھ ہوں —— شہاب الدین کے..... امام صاحب کے یا.....''

—— ''ایک بوڑھے بزرگ نے اپنی دلیل پیش کی..... ہم نہ شہاب الدین کے

ساتھ ہیں۔ نہ امام صاحب کے۔ جو اسلام کی بات کرے گا۔ ہم اس کے ساتھ ہیں۔''

—— ''کیا سچی بات کہی مولانا۔''

لوگوں نے تالیاں بجا کر مولانا کی بات کا استقبال کیا.....

—— ''لیکن جس طرح بی جے پی نے اپنے پر پھیلانے شروع کئے ہیں اس سے لگتا ہے کہیں ایک دن اس کی حکومت نہ ہو جائے۔''

—— ''نہ ابھی اس کے اتنے پر نکلے ہیں نہ یہ دن آئے گا..... جن سنگھ کا کیا حشر ہوا تھا۔ وہ کیسے ٹوٹی.....

—— ''مذہب کے نام پر کوئی پارٹی اس دیش میں راج نہیں کر سکتی۔''

—— ''لیکن بی جے پی آ گئی تو.....؟''

—— ''آ گئی تو پھر دیکھیں گے۔ کہنے اور کرنے میں فرق ہوتا ہے۔ مسلمان بھی یہاں مٹھی بھر نہیں ہیں کہ داؤں کو آزما کر چلے جائیں اور وہ چپ چاپ دیکھتے رہیں۔''

—— ''مسلمانوں میں اتحاد کہاں ہے؟''

—— ''اتحاد ہوتا تو کیا کوئی ہم پر آنکھ اٹھا کر دیکھنے کی بھی کوشش کرتا —— ساری دنیا میں ہم ذلیل و خوار نہ ہو رہے ہوتے۔

—— ''ہمارا کوئی نیتا بھی نہیں۔''

—— ''لیکن بی جے پی آ گئی تو.....''

—— ''آنے کے بعد وہ کچھ بھی نہیں کرے گی —— جس سے مسلمانوں کو خوف محسوس ہو۔ مذہب کو اس نے صرف ووٹ کا ہتھیار بنایا ہے۔ حکومت میں آنے کے بعد اس سے زیادہ خطرہ نہیں ہے۔''

—— ''پھر خطرہ کس سے ہے؟''

—— ''کانگریس سے..... اس کی ہر چال دوغلی ہے۔''

—— ''پہلے دنگے بھڑکاؤ..... پھر مرہم لگاؤ۔''

—— ''یہاں کے ہندو اپنی دکانوں پر بھگوا جھنڈا ''پھہرا'' رہے ہیں۔ ہم کیوں نہ اسلامی جھنڈا:''

—— ''رومالیں روتیں گئیں سادی چپاتیں آ گئیں۔''

——— ''میاں.....انتقامی جذبے سے کچھ نہیں ہونے والا۔ ایک جگہ زیادہ ہو۔ مارلو گے تو کون سا دوسری جگہ پر بچ جاؤ گے۔ یہ بات نہ بھولو کہ پولیس بھی ان کی ہے۔''

——— ''جو کچھ کرنا ہے ہوش وحواس میں کرنا ہے۔''

——— ''اس سے اچھا تھا کہ پاکستان چلے گئے ہوتے۔''

''اور وہاں اپنوں کے ہاتھوں مار کھا رہے ہوتے۔ مہاجر کہلا رہے ہوتے۔ امام صاحب نے کہا ہے.....''

''دکانیں بند رکھنے میں ہمارا گھاٹا ہے۔''

باتیں دیر تک چلتی رہیں۔ اس درمیان دروازہ پر دستک پڑی۔ ایک آدمی باہر دیکھنے گیا۔ پھر اس نے پلٹ کر مولوی عنایت اللہ سے کہا۔

''ایک نوجوان لڑکی آپ کے بارے میں معلوم کر رہی ہے؟''

''میرے بارے میں؟''

مولوی عنایت بھاگ کر باہر آئے۔ دروازہ پر ایک سہمی سہمی لڑکی کھڑی تھی۔

''کون ہو تم.....؟''

مولوی عنایت نے نرمی سے پوچھا———

''میں.....''

یہ لڑکی افروز تھی۔

(2)

افروز نے ایک نگاہ مولوی صاحب کے چہرے پر ڈالی پھر نواب صاحب کا خط آگے کر دیا۔ عنایت اللہ ایک ہی نظر میں خط پڑھ گئے۔

''ہوں، کیسے ہیں نواب صاحب؟''

''اچھے ہیں۔''

''ہوں۔ تمہیں کام کی تلاش ہے؟''

''جی۔''

''یہاں کوئی عزیز؟ پرسان حال ہے؟''

''جی! کوئی نہیں۔''

''نواب صاحب بھی کمال کی چیز ہیں۔ بھول جاتے ہیں کہ وہ نوابوں کا زمانہ ختم ہو گیا جب ہاتھی پالے جاتے تھے۔ اے لڑکی.....

مولوی صاحب نے ذرا زور سے کہا.....معاف کرنا تمہیں برا تو لگے گا مگر بن بلائے مہمان کی دعوت کرنا آج کے دور میں ہاتھی پالنے کے برابر ہوتا ہے۔ رومالی روٹی گئی سادی چپاتی آ گئی۔ خیر۔ تم نے کہا، تمہارا یہاں جاننے والا کوئی نہیں۔''

افروز کا دل دھک دھک کرنے لگا۔ یہ کیسا آدمی ہے۔ شکل وصورت سے بھی اکھڑ، دکھتا ہے۔ اب کیا ہوگا اگر اس آدمی نے اسے یہاں رکھنا پسند نہیں کیا تو، اتنی بڑی دلّی.....وہ کہاں جائے گی۔ کس کے پاس جائے گی۔

''ٹھیک ہے تم اندر جاؤ۔ ابھی ہماری ایک ضروری میٹنگ چل رہی ہے۔''

مولوی عنایت اللہ اسے دوسرے دروازے سے اندر لے آئے۔ آواز دی۔ ''بیگم ذرا دیکھنا تو کون آیا ہے۔''

''اچھا جی۔ آتی ہوں۔''

ذرا سی دیر میں شلوار جمپر میں، بھرے بھرے بدن کی ایک بوڑھی عورت نے اندر قدم رکھا۔ بیگم صاحب کی آنکھوں میں افروز کو دیکھتے ہوئے الجھن سی تھی۔ کون ہے؟ کسی رشتہ دار کا چہرہ بھی نہیں مل رہا ہے، اس دھان پان سی لڑکی میں۔

''یہ ہماری بیگم ہیں.....'' مولوی صاحب نے تعارف کرایا۔

افروز نے دیکھا۔ کسی زمانے میں خوبصورت رہی ہوں گی اور خوبصورت ہی نہیں بلکہ دلکش بھی۔

''کہئے۔ کون ہیں؟''

بیگم صاحبہ کی آنکھوں میں حیرت تھی۔''

''نواب الطاف حسین نے بھیجا ہے۔ کام کی تلاش ہے۔ کچھ دن ہمارے یہاں رہیں گی۔ گھبراؤ نہیں، جوان لڑکی ہے۔ پڑے پڑے روٹیاں نہیں توڑے گی۔ تمہارا ہاتھ ہی بٹائے گی۔

●●

مولوی عنایت اللہ چلے گئے تو بیگم صاحبہ نے اشارہ کیا۔ ساتھ ساتھ آنے کا..... چہرے پر عجیب سی سنجیدگی طاری تھی۔ چہرے کی تراش خراش سے لگ رہا تھا کہ قاعدے قانون کے معاملوں میں کافی سخت رہی ہوں گی۔ تھوڑی ہی دیر میں بیگم صاحبہ نے سارا گھر دکھا ڈالا اور گھر کی تواریخ کا خلاصہ بھی سنا دیا۔ جیسے یہ کہ اس گھر کے دو حصے ہو گئے۔ پیچھے کا ایک حصہ مرمت کے بعد کرائے پر اٹھا دیا گیا۔ ایک لڑکی تھی جس کی شادی ہو گئی۔ لڑکا مسقط میں رہتا ہے۔ بڑا لڑکا شبیر ہے، اس سے چھوٹا نسیم۔ دونوں کی ابھی شادی نہیں ہوئی ہے۔ مولوی عنایت اللہ تو کچھ کرتے دھرتے نہیں ہیں۔ ویسے جو پیدا کرتا ہے وہ پالتا بھی ہے۔ جس کا جہاں رزق ہے اسے ملتا ہی ہے۔ اب پھر ان کا کیا قصور، جس نے پرانے زمانے کی آن بان شان دیکھا ہو، وہ بھلا کافروں کی نظروں میں ذلیل کیوں ہو۔ وہ تو اللہ نے خیر کیا کہ بیٹے سمجھ دار نکل گئے۔ کرائے کے پیسوں سے ہی دونوں لڑکوں نے تجارت شروع کر دی۔ آج صدر بازار میں اچھی خاصی دوکانیں ہیں۔ آمدنی

بڑھ رہی ہے.....

''اے جی، ہاں کیا نام ہے اللہ کی بندی..... افروز..... وہ تو کہتے ہیں سب اللہ میاں کی مرضی ہے جسے چاہے دے۔ جسے چاہے بھوکے مارے..... اور ایک بات جان لو..... جس کا رزق جہاں ہے، اسے ملتا ہی ہے۔ کسی کو دو وقت کھلانے سے گھر میں غریبی نہیں آ جاتی۔ الٹا اللہ کرم ہی کرتا ہے۔ پروردگار اوپر بیٹھا سب دیکھ رہا ہے اور کیوں نہ دیکھے جی۔ ہم کسی کے محتاج ہیں۔ اللہ اللہ سب کچھ اوپر والے کا دیا اس گھر میں ہے ـــــ زیادہ ہوتا ہے تو خیرات ہی کر دیتے ہیں۔ اب چلو..... اللہ اللہ کر کے تم نے گھر دیکھ لیا۔ اب بچوں سے بھی مل لوگی۔ ماشاء اللہ سب اچھے ہیں۔'' بیگم صاحبہ نے مولوی صاحب کے بارے میں بھی بتایا کہ زبان کڑوی سہی مگر دل کے نیک ہیں..... پردہ کے سخت قائل ہیں۔ کیا مجال سینہ سے دوپٹہ ذرا بھی ادھر اُدھر ہو۔ مسقط والی لڑکی بھی جب آتی ہے تو وہ بھی مولوی صاحب کے سامنے تھر تھر کانپتی ہے کہ اٹھنے بیٹھنے میں کوئی اونچ نیچ نہ ہو جائے۔

●●

رات کے 9 بجے تک شبیر اور نسیم بھی دکان سے لوٹ آئے۔ افروز سے ان کا بھی تعارف کرا دیا گیا۔ دونوں عام سے لڑکے تھے۔ جنہیں بیکار قسم کی باتوں سے زیادہ اپنے دھندے سے مطلب تھا۔

رات کے کھانے پر جب سب بیٹھ گئے تو مولوی عنایت اللہ نے غور سے اس کی طرف دیکھا..... اتنے بڑے شہر میں تم اکیلی ہو اور سب سے اہم بات کہ لڑکی ذات ہو۔ دلّی کا تو خیر معاملہ ہی دوسرا ہے۔ کام ملنا تو آسان ہے لیکن عزت بچانی مشکل۔''

''اکیلی لڑکی کے لئے تو عزت بچانی کہیں بھی مشکل ہے۔ چاہے شہر چھوٹا ہو یا ـــــ

بیگم صاحبہ کے ہونٹوں پر مسکراہٹ پھیل گئی۔

شبیر نے کہا..... ''مسلمان لڑکیوں کا کام کرنا جائز نہیں ہے۔''

نسیم نے کہا..... ''وہ بھی دلّی جیسے شہر میں۔ ابھی تم اس شہر سے واقف نہیں ہو۔''

بیگم صاحبہ نے کہا..... ''ہم تو اپنے بچوں اور بچیوں کی شادی کو لے کر بھی کافی محتاط ہیں۔ اب رخسانہ کا ہی لے لو۔ کتنی نسبت آئی۔ لیکن ہم نے بھی طے کر لیا تھا کہ شادی اچھے گھر میں

کریں گے ـــــ شریف اور صاف خاندان میں ـــــ اب ماشاء اللہ شبیر کو ہی لو.....نسبت ڈھونڈی جا رہی ہے.....لڑکیاں تو کئی ہیں۔ ہماری کوئی فرمائش بھی نہیں۔لیکن بس ہم اتنا جانتے ہیں کہ لڑکیاں پڑھی لکھی نہ ہوں۔ پڑھنے لکھنے سے لڑکیوں کا دماغ خراب ہو جاتا ہے۔''

افروز کو برا لگا۔ کہیں اس تنقید کا محرک وہ تو نہیں۔

مولوی صاحب فوراً بولے.....''افروز کا معاملہ دیگر ہے۔نواب صاحب نے خط میں لکھا ہے کہ اس کا پورا خاندان فساد میں شہید ہو گیا۔''

شبیر اور نسیم کھاتے کھاتے رک گئے۔

شبیر کے چہرے پر ناراضگی کی ایک تیز لہر آ کر ٹھہر گئی..... پتہ نہیں ان کافروں کو مسلمانوں سے کیا دشمنی ہے.....میرا تو خون کھول جاتا ہے یہ سب سن کر.....''

نسیم غصّے سے بولا.....''انہیں تو.....''

پھر جانے کیا سوچ کر کہتے کہتے رک گیا۔شاید اسے افروز کا خیال آ گیا تھا۔

''بیگم صاحبہ کہہ رہی تھیں.....ہاں تمہارے ساتھ تو مجبوری ہے۔کماؤ گی نہیں تو کھاؤ گی کیا.....''

مولوی صاحب کے چہرے پر تلخ مسکراہٹ پھیل گئی.....رومالی روٹی گئی سادی چپاتی آ گئی.....زمانہ کتنا بدل گیا.....فساد میں پولیس کے جوان گھر گھر میں گھس کر مسلم عورتوں کی عزت تک لوٹنے سے نہیں چوکتے۔آزمائش کا دور ہے۔''

افروز ان پورے مکالموں کے دوران چپ ہی رہی۔وہ کیا کہتی کہ وہ اپنی پہچان بنانے آئی ہے ـــــ لیکن کیسی پہچان؟ یہاں کے لوگ اس لفظ کو کتنا سمجھ پاتے.....اس لئے وہ جان بوجھ کر خاموش ہی رہی.....

کسی نئے آشیانے کی تلاش تک اسے چپ ہی رہنا تھا ـــــ

(3)

راجپوت ٹریول ایجنسی کے گیٹ سے باہر نکلتے ہوئے افروز کے ذہن میں مسٹر باوا کا صرف ایک ہی جملہ گونج رہا.....

''نو ویکنسی مس افروز.....تم مسلمان ہو معاف کرنا.....اس لئے پوچھ رہا ہوں..... مسلمان لڑکیاں ایسی بہت کم ہوتی ہیں جو تمہاری طرح اسٹرگل کرنے باہر نکلتی ہیں.....تمہارے یہاں اس قدر پردہ ہے.....بائی دوے.....آگے ویکنسی نکلی تو.....''

ٹھک ٹھک.....

مسلمان.....!

تم مسلمان ہو.....؟

تمہارے یہاں اتنا پردہ ہے.....آگے.....

کتنی ہی جگہوں پر اسے اس لفظ سے واسطہ پڑا تھا.....مسلمان.....

مسلمان نہ ہوا، سڑے گوشت سے آئی بدبو ہو گئی.....کسی کو یہ لفظ گالی کی طرح لگا تھا اور کوئی ایسے چونکا تھا جیسے اچانک دھماکہ ہو گیا ہو۔

لیکن وہ حقیقت میں کیا تھی.....

بائی اماں کے گھنگھروؤں کا رشتہ تو مذہب سے بس اسی قدر جڑا تھا کہ وہ نیاز اور فاتحہ کر لیتی تھی.....

اس سے زیادہ.....؟

لیکن یہ سچ تھا کہ وہ مسلمان تھی۔

زندگی کے اس عجیب وغریب اتار چڑھاؤ نے اس کے اندر زہر ہی زہر بھر دیئے تھے۔ ہر چیلنج اور رکاوٹ کو جھیلتے ہوئے وہ مضبوط اور پتھر ہوئی جا رہی تھی۔ وہ لڑنا جان رہی تھی۔ وہ بولنا سیکھ رہی تھی۔ اب وہ صحیح معنوں میں دنیا دیکھ رہی تھی۔ اس کی آنکھیں کھل رہی تھیں۔

●●

دلّی آنے کے بعد واقعات کا ایک ''کارواں'' چلا تھا۔ مولوی عنایت اللہ کا گھر کوئی کم سیاسی اکھاڑا نہ تھا اور ان کے دونوں لڑکے..... جو ذرا ذرا سی بات پر بھڑک جاتے اور ہندو مسلمان نکالنے لگتے تھے۔

●●

ایک دن اس نے دلّی کی سیر بھی کی تھی..... مغلیہ دور کی عمارتیں بھی دیکھی تھیں اور اچانک سن سے رہ گئی تھی..... یہ کیسی ویرانی ہے..... کیسی اداسی..... شہنشاہیت وقت کے ملبے میں دفن ہو چکی ہے..... مگر لوگوں کے ذہن میں آج بھی موجود ہے..... غلامی ہمیشہ زندہ رہتی ہے۔

''تم مسلمان ہو.....''

یہ لفظ ہتھوڑے برسا رہے تھے۔

راجپوت ٹریول ایجنسی کے گیٹ سے باہر نکلتے ہوئے وہ ایک دم چونک گئی۔

ہاں وہی لڑکا ہے..... وہی..... جو باہر انتظار میں بیٹھا تھا..... لمبا چوڑا، گورا چہرہ..... چہرے پر چھائی ہوئی خوفناک اداسی۔ وہ اسی طرف دیکھ رہا تھا.....

''معاف کیجئے گا.....''

افروز گھبرائی نہیں.....

''کیا ہے.....؟''

''آپ..... آپ کا اپوائنمنٹ ہو گیا کیا؟''

''نہیں.....''

''میں بھی کام کی تلاش میں آیا تھا۔''

(☆) یہ ناول میں 1990ء میں مکمل کر چکا تھا۔ اس وقت تک بی جے پی نے اقتدار نہیں سنبھالا تھا۔

اس کے چہرے پر مایوسی تھی۔

''تھوڑا سا تھ دیں گی آپ.....؟''

''جی.....''

''بس یوں ہی..... تھک گیا ہوں۔ بات چیت کر کے تھوڑا دل بہلانا چاہتا ہوں۔

''جی.....''

وہ ساتھ ساتھ چلنے لگی۔

''میرا نام شعیب ہے۔ مسلمان ہوں۔ گریجویٹ ہو جانے کے بعد نوکری کی راہ تکنے لگا..... یہ میری بیوقوفی تھی۔ میرے کئی دوست تجارت میں چلے گئے۔ ایک دوست نے سمجھایا بھی تھا۔ محنت مت کرو۔ کوئی فائدہ نہیں..... بڑی بڑی نوکریوں پر پہلے سے ہی ہندو امیدوار بیٹھے ہوئے ہیں۔ تمہیں نہیں ملنے والی.....''

''جی.....'' وہ بولے چلا جا رہا تھا۔

''میری غلطی تھی۔ میں یہ سب نہیں سوچتا تھا۔ اپنے ٹیلنٹ پر بھروسہ تھا۔ بہت جگہ عرضیاں دیں..... مگر..... نوکری کا ارمان لئے باپ انتقال کر گئے..... وہاں..... ہوٹل میں بیٹھ کر چائے پیتے ہیں..... اس نے اشارہ کیا.....

''جی.....''

اس نے انکار نہیں کیا..... چائے کی میز پر دونوں آمنے سامنے بیٹھ گئے۔

●●

اس نے پھر کہا..... ''آپ حیران ہو رہی ہوں گی کہ میں یہ سب آپ کو کیوں بتا رہا ہوں۔ لیکن کبھی کبھی کوئی چہرہ ایسا لگتا ہے کہ اپنا پن کا احساس ہوتا ہے ـــــ تب اندر سے ایک آواز آتی ہے کہ اپنا من ہلکا کر لو۔ یہ وہ چہرہ ہے جسے تم اپنا دکھ کہہ سکتے ہو۔ معاف کرنا۔ مجھے غلط مت سمجھنا۔ میں بھی اس بات کو نہیں مانتا تھا کہ اس ملک میں مسلمانوں کو نوکری نہیں مل سکتی..... آخر مل ہی رہی ہے۔ حکومت سے لے کر ہر جگہ اچھے اچھے عہدوں پر مسلمان مل جائیں گے..... پھر بھی اسے غلط طرح سے مت لیجئے گا..... تھوڑی بہت بے ایمانی تو ہے ہی..... کاسٹ ازم یہاں بہت زیادہ ہے۔ میری سروس کی عمر نکل گئی..... لیجئے..... چائے پیجئے۔

بیرا چائے رکھ گیا تھا۔ افروز نے چائے پیتے ہوئے نوجوان کو غور سے دیکھا۔

''مایوسی کفر ہے..... میں کیا کروں۔ اب یہاں پرائیویٹ دفتروں میں دھکے کھا رہا ہوں۔ آپ؟''

''میں''.....افروز تھوڑا جھجکی.....

معاف کیجئے گا۔ یہاں لڑکیوں کو نوکری ذرا جلد مل جاتی ہے۔ قاعدے سے آپ کو بھی مل جانی چاہئے تھی۔ کیوں؟ ویسے آپ کی کوالیفکیشن؟

''میں دسویں پاس ہوں۔''

اس نے نظریں جھکا لیں۔ ''آگے کے لئے راستے اچانک بند ہو گئے۔''

''اوہ.....''

اس نے ایک ٹھنڈی سانس بھری۔ پھر ایک بے معنی سا قہقہہ لگایا۔

''ویسے ہم نے شروعات ہی غلط کی۔ یعنی جو بعد میں پوچھنا چاہئے تھا وہ پہلے پوچھ لیا۔ سب سے پہلے تو آپ کا نام آتا ہے۔''

''افروز.....!''

''آپ.....آپ مسلمان ہیں۔''

وہ ایک دم چونک پڑا۔

''یہاں کہاں رہتی ہیں آپ؟''

''مجھے کام بھی چاہئے اور رہنے کی جگہ بھی۔''

''فیملی؟''

''کوئی نہیں۔''

''یعنی.....؟''

''جو تھے شہید ہو گئے۔''

اس کا چہرہ اچانک فق ہو گیا۔ وہ غور سے اس کے چہرے کو دیکھنے لگا۔

''مائی گاڈ.....لیکن اکیلے آپ.....''

افروز نے محسوس کیا، وہ اس کی عمر اور اکیلے پن کا اندازہ لگا رہا ہو——

''اتنی بڑی دنیا.....کوئی نہیں ہے.....آپ کی ہمت کی داد دینی پڑے گی۔''

''کوئی ہمت کی بات نہیں ہے۔'' افروز کو برا لگا۔ ایک مجھے ہی کیا..... میرے جیسے بہت سے لوگ ہیں..... بزدلی کی تھکا دینے والی کہانیاں ہی انسان کو کمزور بنایا کرتی ہیں۔ جیسے ایک جنگ آپ لڑ رہے ہیں، ویسے ہی میں لڑ رہی ہوں.....آخر فرق کیا ہے؟''

''آئی کانگریچولیٹ یو.....''

شعیب مسکرایا.....''بہت دنوں بعد ایک ایسی مسلم لڑکی ملی ہے.....''

وہ ایک دم غصّے میں آ گئی''.....پھر وہی مسلم لڑکی.....آخر کتنی مسلم لڑکیوں کو دیکھا ہے آپ نے.....؟ فلموں میں جھانکئے تو وہاں بھی سینکڑوں مسلمان لڑکیاں آپ کو نظر آ جائیں گی..... آخر مسلم لڑکیوں کا کام کرنا آپ جیسے ترقی پسند لڑکوں کو آج کے زمانے میں بھی کیوں برا لگتا ہے۔ آخر اس میں بڑی بات کیا ہے۔ جیسے سب کرتے ہیں ویسے میں کروں گی۔''

''آپ کے خیال سے قوت ملی ہے۔''

شعیب خوش خوش نظر آ رہا تھا۔

''میں تو یہاں سے مایوس لوٹ کر گھر واپس ہونے کے بارے میں سوچ رہا تھا۔ اب نہیں جاؤں گا۔ لیکن ایک بات ہے۔ آپ برا تو نہ مانیں گی۔''

''بالکل نہیں۔''

''آپ اکیلی ہیں۔ نوکری بھی کرنا چاہتی ہیں—— ذرا کچھ دن..... کچھ دن ایک تجربہ کر کے دیکھتے ہیں۔ کیا ضروری ہے ہر جگہ مسلمان نام کو Impose کیا جائے—— کیوں، کیا، فرق پڑتا ہے؟

''مطلب؟'' وہ چونکی

''مطلب مسلمان ہو، یہ تم بتاؤ ہی نہیں۔''

''کیا؟''

''اس سے تم زیادہ محفوظ رہو گی۔ یہ میرا اپنا تجربہ بتاتا ہے۔''

اس نے پھر ایک ہلکا سا قہقہہ لگایا۔

''شیکسپیئر نے کہا تھا، نام میں کیا رکھا ہے؟ نام میں سچ مچ کچھ نہیں رکھا—— لیکن وقت کے ساتھ نام پر اثر پڑا ہے۔ اب اگر تم نام بدلتی ہو تو اس سے تم بہت سارے بے مطلب سوال و جواب سے بچ جاؤ گی۔ مثلاً.....جیسے تم نے پہلے بتایا۔ اتنا پردہ ہے۔ آخر تم مسلمان لڑکی ہو

کر گھر سے باہر کیسے نکلی ـــــــ کسی قسم کی کوئی سختی تو نہیں ہے؟ تمہیں کوئی پریشانی تو نہیں ہوگی وغیرہ وغیرہ.....خفا، مت ہونا..... ہمارے محدود معاشرے میں تم قدم قدم پر ایک بچھو گھاٹی پاؤ گی اور تمہارا جینا دوبھر ہو جائے گا۔''

''جی.....''

چائے ٹھنڈی ہو چکی تھی.....

افروز چپ تھی.....

''آؤ چلیں۔''

اس کے ذہن میں دھماکے ہو رہے تھے۔ ٹھک ٹھک.....تم مسلمان ہو ـــــــ جیسے ہزاروں توپیں گرج رہی تھیں۔

●●

ایک ساتھ دونوں باہر آ گئے۔

چلتے وقت شعیب نے ایک بار پھر کہا.....''افروز اس بارے میں سوچنا ضرور۔''

سامنے ٹریفک کی لال بتی روشن تھی اور گاڑیوں کے بے ہنگم شور تھے ـــــــ

(4)

''میرا نام انجو ہے''

وہ شخص چہرے سے ہی خوفناک لگ رہا تھا۔ کافی لحیم شحیم۔ چمکتا ہوا اجلا کرتا پائجامہ پہنے۔ فائلوں سے گھرا ہوا۔ کاغذات ادھر ادھر بکھرے ہوئے.....انجو کی بات اس نے بیچ میں ہی کاٹ دی۔

''مجھے نام سے نہیں کام سے مطلب ہے۔''

جیب سے نکال کر سگریٹ سلگاتے ہوئے اس نے بیل پر ہاتھ رکھا۔ چند لے سر والا ایک ادھیڑ عمر کا چشمے والا آدمی سامنے آیا۔

''جی سر''

''ٹنڈن یہ آج سے ہمارے دفتر میں کام کریں گی۔ انہیں سب کام سمجھا دو۔ اس نے اشارہ کیا۔ جائیے سب کام اچھی طرح سمجھ لیجئے۔''

''جی''

انجو کی سمجھ میں یہ بات نہ آئی کہ وہ کیا کرے.....خوش ہو یا حیران.....وہ تو ایک اخبار میں ''ایک ہفتہ وار اخبار کے لئے ضرورت ہے'' کا اشتہار دیکھ کر آئی تھی.....لیکن یہاں.....نہ اس سے کچھ کام پوچھا گیا نہ ہی.....اور یہ شخص.....فی الحال اسے کام کی ضرورت تھی۔ نوکری چاہئے تھی۔ پیسے چاہئے تھا.....اس لئے اس نے حامی بھر لی۔

●●

کام.....اس نے کام کا جائزہ لیا تو اس کی آنکھیں حیرت سے پھیلتی چلی گئیں..... پیسے کمانے کے کتنے طریقے ہیں۔صرف ڈھنگ آتا ہو۔کیسے کیسے بزنس ہیں.....وہ شخص جس کا نام راج سنگھل تھا۔وہ کسی اخبار وخبار کا ایڈیٹر نہیں تھا بلکہ.....

●●

پہلے دن ہی اس نے سب کچھ دیکھ لیا۔اسے سب کچھ معلوم ہوگیا تھا۔وہ دفتر کے کمرے میں آئی تو وہاں 'کام' چل رہے تھے..... پانچ چھ لڑکیاں۔اتنے ہی لڑکے..... پرانے پرانے ماہناموں اور اخباروں سے کٹنگ کر رہے تھے اور کنکس سیلقے سے چپکائے جا رہے تھے۔

''یہ..... یہ سب.....''

ٹنڈن خاموش طبع آدمی تھا۔وہ آہستہ سے بولا۔

''ہمارے ساتھ رہئے۔چند دنوں میں سب کچھ جان جایئے گا۔''

ذرا ٹھہر کر اس نے بتایا..... سنگھل صاحب دس ماہناموں کے مدیر ہیں، چھ ہفتہ وار ہیں۔بارہ پندرہ روزنامے.....اور چار روزانہ.....

''لیکن یہ سب۔''

''بازار میں نہیں جاتیں.....یہی نا۔''

ٹنڈن نے ٹھنڈی سانس بھری.....ہم صرف کاغذا کارروائی پوری کرتے ہیں۔مختصر میں بتاؤں تو سنگھل صاحب کاغذ کا کوٹہ کھاتے ہیں۔یہی بزنس ہے ان کا۔''

ٹنڈن بگڑا.....''آم کھاؤ..... گٹھلی سے کیا کام۔پیسے وقت پر ملتے رہیں۔اس سے زیادہ ہمیں اور کیا چاہئے۔''

دھیرے دھیرے اسے سب کچھ معلوم ہوگیا کہ سنگھل کتنی بڑی توپ ہے۔اس کے اثر رسوخ کتنے ہیں۔اس کی کس قدر سیاسی پہنچ ہے۔کتنا دیئے لئے رہتا ہے.....یہی نہیں، اس کا یہ بزنس کسی سے چھپا ہوا نہیں ہے.....لیکن آج تک کوئی ایسی ویسی بات نہیں ہوئی..... سنگھل صاحب قانونی داؤں پیچ اتنا جانتے ہیں کہ ان کا کوئی کچھ بھی بگاڑ نہیں سکتا۔

●●

انجو ایک ہی چیز سوچ رہی تھی۔وہ نوکری کرے یا نہیں.....

لیکن ابھی نوکری ضروری تھی..... وہ مولوی عنایت اللہ کے گھر زیادہ دنوں تک بوجھ نہیں بننا چاہتی تھی۔وہاں مسلمان ہونے کا تذکرہ کچھ زیادہ ہی چلتا تھا۔

انجو کو لگا تھا.....فرقہ واریت کا جنم یہیں سے ہوتا ہے.....ہوتا ہے نا..... جب تم ایک مخصوص زاویہ پر آکر ٹھہر جاتے ہو.....پھر.....دوسرا ملک؟ دوسرا آدمی؟ دوسرا مذہب.....؟

یہ 'دوسرا' کیا ہوتا ہے انجو.....؟

یہ دوسرا ہی تو فرقہ واریت کا جنم داتا ہے.....

یہ دوسرا ہی تو سارے فساد کی جڑ ہے.....

یہ دوسرا آخر کہاں سے ٹپک پڑتا ہے.....

نہیں..... وہ اس مکان میں نہیں رہے گی۔ یہاں آس پاس، گلی کوچوں، تنگ تنگ گلیوں سے گزرتے، اندر باہر کرتے، وہ ایک گھناؤنے احساس سے دوچار ہوتی رہی ہے۔

''تم کون ہو.....''

یہ دستکیں، مستقل ہونے والی یہ دستکیں اس کا پیچھا کیوں نہیں چھوڑتیں.....

''تم مسلمان ہو.....''

پھر تیز قہقہہ کی آواز.....نام میں کیا رکھا ہے.....

ایک بار نام بدل کر دیکھو تو سہی.....

مسلمان کے نام پر تو مکان بھی نہیں ملتے.....کئی لوگ تو مسلمان سمجھتے ہی بھگا دیتے ہیں۔جایئے مکان نہیں ہے۔ہم تو سمجھ رہے تھے کہ آپ.....،

ملیچھ کہیں کا.....

ایک تجربہ کر کے دیکھو افروز.....

پھر وہ ان تنگ گلیوں سے نکلی تھی۔ جہاں مولوی عنایت اللہ رہتے تھے اور اسی بے نام دفتر میں اس نے اپنی ایک میز لے لی تھی۔

●●

اندر ایک عجیب قسم کا غصہ، جسے وہ کوئی نام دے سکنے سے مجبور تھی۔قطرہ قطرہ کر کے جمع ہو رہا تھا۔اس غصّے کا انت کیا تھا؟

جب کوئی بہت بڑی مجبوری ہوتو.....؟

شروع شروع میں یہ انجو نام اسے کچھ عجیب سا لگا تھا لیکن جب کسی کی ذات ایک دم سے اکیلی ہوتو اجنبیت کا احساس جاتا رہتا ہے۔

اتنا تک تو ٹھیک تھا، لیکن جہاں رہنے کے لئے اس نے کمرہ لیا تھا۔ وہ جگہ اسے زیادہ راس نہیں آرہی تھی۔ اس نے پہلی فرصت میں مکان چھوڑنے کا فیصلہ کرلیا تھا۔ لیکن فی الحال کم پیسوں میں اپنے لئے اچھے مکان کا بندوبست وہ کہاں سے کرتی۔

یہ ڈیلائٹ سنیما کے پیچھے کا علاقہ تھا۔ جو پرانی دلی کا علاقہ ہی کہلاتا تھا۔ چھوٹی سی تنگ گلی پار کرکے اندر جانا پڑتا تھا..... یہ ایک خستہ حال کمپلیکس تھا۔ ون روم فلیٹ..... یہاں تقریباً آبادی مسلمانوں ہی کی تھی۔ یہ جگہ بھی عنایت اللہ صاحب کی مہربانی سے ہی ملی تھی۔

ڈیلائٹ سنیما سے اندر گھستے ہی ناک پر رومال رکھنا پڑتا تھا۔ کٹے ہوئے بھینس کے گوشت کی تیز بدبو ـــــ خون کے چھینٹے..... پوری گلی اور آس پاس کا علاقہ پانی سے تر بتر رہتا۔ کھونٹے سے لٹکے کالے کالے بھینس چاروں طرف بندھے نظر آتے۔

اسے یہ کوئی قتل گاہ نظر آتی۔ جہاں چاروں طرف خون بہہ رہا ہے۔ تیز بدبو چاروں طرف پھیلی ہے۔ انسانی جسم لہولہان چاروں طرف پڑے ہیں..... اسے محسوس ہوتا..... افروز تمہارے اندر کی عورت سو رہی ہے.....ایک دن وہ پتھر کی ہوکر رہ جائے گی۔

وہ کٹتے ہوئے بھینسوں کی دل چیرنے والی صدا سنے گی۔ گلیوں میں پھینکی ہوئی ہڈیوں کو دیکھے گی اور ایک دن جذبات واحساسات سے بیگانہ ہوجائے گی۔

●●

شیش محل جہاں وہ رہتی تھی، یہ اس جگہ کا نام تھا..... کیسا عجیب نام؟ اسے خود حیرت تھی.....کہاں تو صرف ایک زلزلے کے جھٹکے کے انتظار میں کھڑا مکان اور نام.....

مکان کے رہنے والے بھی عجیب تھے.....

●●

یہ اس کی زندگی کا سب سے خوفناک تجربہ تھا.....کہنا چاہئے .....زندگی کی جو تلخیاں اس نے یہاں آکر محسوس کیں۔ پہلے کبھی محسوس نہیں ہوئیں.....

ایک دن ایک خوبصورت سی گول مٹول سی بچی اس کے سامنے آکر کھڑی ہوگئی۔

''کچھ پیسے ہیں..... اماں سبزی کے لئے مانگ رہی ہیں..... میرا باپ اسمیک پیتا ہے۔ سب پیسے اسمیک میں اڑا دیتا ہے۔''

''اسمیک۔''

یہ نام تو اس نے دلی آکر ہی سنا تھا۔ لوگ اس طرح کا زہریلا نشہ بھی کرتے ہیں۔ یہ تو اس نے یہاں آکر ہی سب سے پہلے جانا.....اور یہ چھوٹی سی بچی، اس کو سب پتہ تھا..... پتہ تھا کہ بابو بھائی رکشہ والا اسمیک پی کر مر گیا.....ایک دن ایسے ہی اس کا باپ بھی مر جائے گا.....

ٹن.....ٹن.....

کوئی گوشت کوٹنے والi موسل سے اس کے دماغ پر ضرب لگا رہا تھا.....

علی الصباح اڑوس پڑوس میں مہابھارت چھڑ جاتی..... گالی گلوج شروع ہو جاتی۔ اسے دیکھنے والی شک بھری آنکھیں ہوتیں.....ایسی ہی، ایک اُمس بھری صبح، ایک جھرّی بھرے چہرے والی عورت اس کے آگے رو رہی تھی.....

''میرا مرد..... مجھے مارتا ہے.....اسمیک پیتا ہے نا.....''

اس نے بہت غور سے دیکھا، تب پتہ چلا۔ عورت کی عمر زیادہ سے زیادہ تیس کی ہوگی۔ اس سے زیادہ نہیں.....خوراک کی کمی نے اس کی یہ حالت بنادی تھی.....اس کا دل غصّے سے بھر جاتا.....تبلیغ.....تبلیغ چلانے والے مولوی عنایت اللہ جیسے لوگ ان گھروں میں کیوں نہیں آتے۔ یہ بھی تو ایک جگہ ہے.....لیکن ان کے پیٹ سے سٹی، بھوکی انتڑیوں کو تبلیغ سے زیادہ روٹی کی ضرورت ہے ـــــ اور مولوی عنایت اللہ جیسوں کے پاس ان کے لئے روٹی نہیں ہے.....

●●

ایک دن اچانک راستے میں اسے شعیب مل گیا شعیب ان چند مہینوں میں برسوں کا بیمار نظر آرہا تھا۔

''کہاں رہتی ہو.....؟''

اس نے پتہ دے دیا.....

''آنا مت.....ورنہ لوگوں کو الزام لگاتے دیر نہیں لگے گی.....''

شعیب ہنسا.....اس نے ایک دفتر کا فون نمبر دیتے ہوئے کہا..... یہاں رنگ کرسکتی ہو۔ یہ میرے دفتر کا ہی فون نمبر ہے۔ ہمارے وجود کی طرح ایک بے نام دفتر..... وہ پھیکی ہنسی ہنسا.....

''مطلب''

''خیر چھوڑو.....تم اپنا سناؤ۔''

''میں''

وہی زندہ دل ہنسی شعیب کے لبوں پر اتنا ٹوٹنے کے باوجود قائم تھی.....ایک نیا دوست 'دوست' مل گیا ہے.....

ونئے.....فی الحال اسی کے ساتھ شیئر کر رہا ہوں.....''

''یعنی مکان مل گیا۔''

''مکان یہاں ہم جیسوں کو کہاں ملتا ہے۔ایک کمرہ ہے بس.....''

''تم، خوش قسمت ہو..... پتہ نہیں مجھے ابھی یہاں اور کتنے دھکے کھانے باقی ہیں.....''

''پھر وہی مایوسی''

''نہ، مایوس نہیں ہوں.....لیکن ہارنے..... مستقل ہارنے کی بھی اپنی حد ہوتی ہے..... کبھی کبھی لگتا ہے تقدیر میں، اچھی نوکری لکھا کر لایا ہی نہیں۔

''ایسا کیوں سوچتے ہو۔''

شعیب پھر ہنسا.....میرا عقیدہ اب پہلے سے زیادہ مضبوط ہوتا جا رہا ہے کہ اس ملک میں مسلمانوں کے لئے ایک اچھی سی نوکری اب ناممکن سی چیز بن کر رہ گئی ہے۔''

''چلو گھر چلتے ہیں.....''

انجو بوجھل قدموں سے اٹھ کھڑی ہوئی۔

(5)

وہاں پھر کسی کی موت ہوگئی تھی۔ زور زور سے دہاڑیں مار مار کر رونے کی آواز آرہی تھی۔ انجو نے باہر نکل کر پوچھا۔ وہی لڑکی تھی۔ لوگ سمجھانے کی کوشش کر رہے تھے.....لڑکی ماں کے سر میں سر ملا رہی تھی.....میرا باپ اسمیک پیتا ہے!

کانوں کے پاس اس جملے نے جیسے چیخنا شروع کر دیا تھا۔

اس نے تیزی سے دروازہ بند کیا.....اور پھر دفتر کے لئے تیار ہونے لگی۔

●●

اب دفتر میں اس کی پہچان کے دائرے بڑھ چکے تھے۔ سیما، شانتا، چھایا، اگنی ویش، رما کانت اور ٹنڈن.....سب کو ان کی مجبوریاں یہاں کھینچ لائی تھیں ورنہ ایسے بے نام دفتر میں کام کرنے کی، کس کی خواہش ہوتی ہے۔

ابھی پچھلے دنوں ہی اس سے ٹنڈن صاحب دیافت کر رہے تھے۔ تم مسلمانوں کے محلے میں رہتی ہو۔ ڈر تو نہیں لگتا..... میں تو کہتا ہوں کہ جتنی جلد مکان خالی کر دو اتنا بہتر.....تم نہیں جانتی.....بھیڑ بکری کاٹنے والوں کے پاس ہمدردی اور پیار کا فقدان ہوتا ہے۔

شانتا بولی تھی.....چھی چھی.....اتنی گندی جگہ۔

سیما نے کہا تھا..... جو بھی ہو، مسلمان بہت گندے رہتے ہیں۔ کیوں انجو؟

اگنی ویش نے بھی ہمدردی کا مظاہرہ کیا..... وہ جگہ ٹھیک نہیں تو پھر میرے محلے میں آجاؤ۔ بہت سے پراپرٹی ڈیلر میرے جان پہچان کے ہیں۔ تمہیں کوئی مناسب اچھی جگہ تو مل ہی

جائے گی۔

وہ ہنسی تھی.....اچھے پیسے بھی چاہئے۔

ہاں یہ تو ہے۔

''سنگھل صاحب کے یہاں رہنا ہے تو فی الحال اسی سے کام چلانا ہوگا۔''

●●

تنہائی اور اکیلے پن کا احساس کیسی عجیب عجیب باتوں کو جنم دیتا ہے۔ دن تو جیسے تیسے کٹ جاتا لیکن رات کی تنہائیاں اس کا جینا حرام کر دیتیں.....لیکن دھیرے دھیرے وہ اکیلے پن کی عادی ہوگئی۔

لڑکی اکیلی ہو تو لوگ کیسی کیسی نظروں سے گھورتے ہیں۔ بس، منی بس، میں کیسی کیسی بدتمیزیاں ہوتی ہیں اور پھر وہی ایک سوال.....

آپ اکیلی ہیں.....کمال ہے۔ کیسے رہتی ہیں آپ؟

●●

دوپہر میں شعیب کا فون آیا تھا.....

''اے گڈ نیوز فار یو۔''

''کیا ہے۔''

''شام کو ملنے پر ہی بتاؤں گا۔ مل رہی ہو نا؟

''دیکھا جائے گا۔''

''نہیں ملنا ضروری ہے۔ میرے ساتھ ونئے بھی ہوگا۔''

●●

اور وہیں اس نے ونئے کو دیکھا تھا۔ پہلی بار ـــــــ شعیب کا روم پارٹنر.....شرمایا شرمایا سا ونئے۔

''آپ کی تعریف سنی تھی۔ آپ جیسی لڑکی کا.....''

اس نے بات کاٹ دی۔ ''آپ دلی کسی کے ساتھ آئے تھے کیا؟''

''نہیں اکیلے ہی.....'' وہ چونکا۔

''پھر.....''

ونئے ایک دم سے چونک پڑا ـــــــ 'اوہ گریٹ!'

ونئے شعیب سے ہنس کر بولا ''مان گئے یار تمہاری پسند۔''

وہ شعیب سے بولی.....اب بتاؤ۔ وہ گڈ نیوز کیا ہے؟

''ایسے ہی کہہ دوں یا مٹھائی بھی منگواؤں۔''

''فی الحال یوں ہی ٹھیک ہے۔ کہیں چائے پی لیں گے۔''

''میرا اعتقاد ٹوٹ گیا۔''

اس نے قہقہہ لگایا۔ ایک پرائیویٹ فرم میں نوکری مل گئی ہے۔ سیلری ٹھیک ٹھاک ہے۔

''تب تو صرف چائے سے کام نہیں چلے گا۔'' انجو زور سے ہنسی۔

چائے پیتے ہوئے ونئے نے پوچھا۔ ''تمہیں انجو کہوں یا افروز؟''

''کچھ بھی۔ دوست کہہ سکتے ہو۔''

''لیکن یہ نام کیوں بدلا؟''

''مشورہ میرا تھا یار ـــــــ شعیب نے قہقہہ لگایا۔

''لیکن کیوں؟'' ونئے سنجیدہ ہوگیا۔

''کوئی خاص بات نہیں'' انجو نے بات کاٹتے ہوئے کہا۔ افروز سے بہت سارے سوال جواب پیدا ہو جاتے تھے۔ کہاں کی ہو؟ گھر کہاں ہے؟ ممی ڈیڈی کہاں ہیں اور ایک بے کار سا سوال جسے سن کر مجھے غصّہ آجاتا تھا۔

''کمال ہے مسلمان لڑکی ہو کر.....''

''انجو نام سے یہ سوال پیدا نہیں ہوتے؟''

''یہی تو حیرانی ہے۔ جواب یہاں بھی دینے پڑتے ہیں لیکن اتنے سارے نہیں۔''

''پھر بھی یہ ٹھیک نہیں۔''

ونئے بولا.....اس کمزور سسٹم کا ہم بھی ایک حصہ ہوگئے تو؟ ہمیں تو اس کے خلاف جنگ لڑنی ہے۔''

''تمہیں بتانا بھول گیا'' شعیب تیزی سے بولا۔ ونئے یہاں ریٹپری میں

ایکٹر ہے ـــــ اپٹا (IPTA) کا خاص ممبر ہے۔

''اچھا.....''

''یہ ٹھیک نہیں انجو..... مذہب کو جن لوگوں نے اپنے سیاسی صندوق میں بند کر رکھا ہے، ہم ان سے ڈر جائیں.....تم افروز ہو اور تم افروز ہی رہو گی۔ میں تو تمہیں افروز ہی پکاروں گا۔ تمہیں کوئی اعتراض.....؟''

''بالکل نہیں.....لیکن پلیز۔ آفس میں فون کرتے وقت خیال رہے۔''

''بُرا تو مجھے بھی لگتا ہے.....لیکن جھوٹ پر جھوٹ بولتے ہوئے زیادہ برا لگتا ہے۔'' انجو کے چہرے پر مسکراہٹ آ گئی۔

ونئے بھی ہنس پڑا.....''ایک زندگی میں ہمارے کتنے چہرے ہو جاتے ہیں۔ یہاں سب کے یہی حال ہیں۔ سب کے سب بھیس بدلے ہوئے ہیں.....''

ونئے نے پھر بات چیت کو سنجیدگی کا رخ دے دیا تھا۔

انجو بے خیالی میں دوسری طرف دیکھنے لگی تھی۔

(6)

پھر کتنے ہی سال آندھی اور طوفان کی طرح گزر گئے۔

وقت بدلا تھا اور بدلتے وقت کے ساتھ انجو زمانے کی بدلی بدلی آنکھیں دیکھ رہی تھی۔

اس بیچ کیسی کیسی سیاسی ہلچل مچی.....

ملک کے نقشہ پر چاروں طرف خون ہی خون بکھر گیا۔ کچھ موقع تو ایسے بھی آئے کہ اسے اپنے اس غیر مانوس نام سے تسلی سی ملی تھی۔

ہاں وہ محفوظ ہے.....

لیکن کہاں کون محفوظ تھا؟ فرقہ وارانہ آندھیوں میں کس کا خیمہ محفوظ تھا؟

سرکاریں ٹوٹی تھیں۔

پھر نئی سرکاریں آئیں.....

خونی رتھ سڑکوں پر دوڑتا رہا.....

وقت کے پہیئے خون میں ڈوبے تھے ـــــ اور نفرت کا رتھ تیز رفتاری سے پورے ملک میں دوڑ رہا تھا۔ اس درمیان ملک کے سیاسی جغرافیہ نے بھی کیسے کیسے حادثے تاریخ کی کتابوں میں قید کئے.....سچ تو یہ ہے کہ وہ کچھ بھی نہیں بھولی.....سب کچھ یاد ہے.....

اور ہر بار ہمیشہ کی طرح جیسے کوئی ہتھوڑے سے اس کے ذہن پر ضرب لگا رہا تھا.....

''تم.....کون ہو تم.....؟

''انجو ہو یا افروز.....؟''

یا وہ اپنے نام کی پہچان ہی کھو بیٹھی ہے۔

تب.....

●●

تب وہ رانی منڈی میں تھی۔ اسے سب کچھ دھندلا سا یاد ہے۔

دوپہر کا وقت ہوگا..... بائی اماں کے گھنگھرو ریہرسل میں مصروف تھے۔ بوڑھے سازندے رشید میاں پاس ہی بیٹھے تھے۔ اچانک سڑک پر ہلچل مچ گئی۔ لوگ بھاگ دوڑ رہے تھے۔ ذرا سی دیر میں پولیس جیپ سڑکوں پر ناچ رہی تھی۔

وہ اٹھ کر بائی اماں کے ساتھ بالکنی پر آ گئی۔

سڑک سنسان.....

بدی ماما خبر لائے ـــــ غضب ہو گیا۔ اندرا گاندھی قتل کر دی گئیں۔

کس نے قتل کیا؟ سازندے رشید میاں کے چہرے پر ہوائیاں اڑ رہی تھیں۔

''کہیں کسی مسلمان کا ہاتھ tv نہیں؟''

بائی اماں کا چہرہ فق ہو گیا۔

اور رشید میاں کمزور آواز میں بولے تھے.....''گوہر جان دعا کرو کہ اس قتل میں کسی مسلمان کا ہاتھ نہ ہو..... گاندھی جی کے قتل کے وقت بھی شہر ایسی ہی بھیانک خاموشی میں کھو گیا تھا.....''

''اگر کوئی مسلمان ہوا تو؟'' بائی اماں کے گھنگھرو کانپ کر رہ گئے۔

افروز کے ننھے سے دماغ میں خطرے کی گھنٹیاں اس وقت بھی چیخی تھی.....اور وہی گھنٹیاں اب زیادہ تیز آواز چیخ رہی تھیں.....

●●

فرقہ وارانہ آندھیوں نے پورے ملک پر قبضہ کر لیا تھا۔ مندر مسجد کے ہنگامے نے وطن پرستی کے پاک جذبے کا گلا گھونٹ دیا تھا۔ اب انسان کہاں باقی ہے۔ باقی تھے۔ ہندو یا مسلمان ـــــ یا فرقہ واریت کا ترشول.....نفرت کی تیز آندھی اٹھی تھی اور.....

یہ آندھی رہ رہ کر تیز ہو جاتی اور پورا ملک گرد و غبار میں ڈوب جاتا۔

وہ بدلنے والی تیزی سے بدلنے والی، آنکھوں کو محسوس کر رہی تھی۔ وطن کے لئے سوئے

ہوئے جذبے کو ـــــ فرقہ پرست پارٹیوں کی بڑھتی ـــــ ہوئی طاقت کو، حکومت کے پاس اب ووٹ بینک کے نام پر کچھ تھا۔ تو صرف دھرم کی باسی روٹیاں تھی۔ چرمری اور سوکھی روٹیاں۔ دکانوں پر خونی کیسٹ تھے اور ہونٹوں پر لہولہان سے لفظ۔

انجو سب کچھ دیکھ رہی تھی.....

تقسیم کے وقت کی خونی داستانیں بھی اس نے سن رکھی تھیں۔ یہ قصّہ تب کتنے لوگوں کی زبان پر تھے۔ دردناک، وحشت ناک اور.....

لیکن اب کے قصّے تو تقسیم کی کہانیوں کو بھی شرما گئے تھے۔

رتھ یاترائیں نکلتیں.....

نفرت یاترائیں نکلتیں.....

اور ملک کے نقشے پر لہو ہی لہو پسر جاتا.....

یہ سب کیا ہے.....؟

کیا سب کچھ ایسا ہی رہے گا.....؟ کچھ نہیں بدلے گا؟

ذہنوں کی خلیج کبھی نہیں پاٹی جائے گی.....

●●

اس نے دیکھا تھا.....اور گہرائی سے محسوس کیا تھا۔ مذہب سب کے دلوں میں سختی سے ڈیرا جمائے ہے۔ باہر چاہے لفظوں میں، اس چہرے پر نقاب ڈالنے کی کوششیں کیوں نہ ہوتی ہوں۔ مگر آسانی سے چہرے کے دوغلے پن کو ٹٹولا جا سکتا تھا.....

●●

سنگھل صاحب کا پریس اس نے بہت دن ہوئے چھوڑ دیا تھا۔ وہ ان برے دنوں کو اب حافظے میں محفوظ نہیں رکھنا چاہتی تھی..... ایک بے نام سا دفتر ـــــ ایک بے نام سا اخبار ـــــ کبھی کبھی لگتا وہ بھی بے نام سی ہو گئی ہے۔ اس کیفیت سے باہر نکلنے کے لئے اس نے قلم کا مورچہ سنبھالا تھا.....اب وہ خاموش نہیں تھی.....اب ایک نیا دفتر تھا۔ ایک نیا سا پتا ہک جن مانس.....

یہاں وہ دل کی بات کہہ سکتی تھی۔ بائی اماں کے گھنگھرو اب بھی رہ رہ کر اس کے ذہن

دماغ میں گونج جایا کرتے تھے۔تب سب کچھ یاد آ جاتا..... بدی ماما بھی ـــــــ دروازہ توڑ کر بے ہنگم سا قہقہہ لگاتا ہوا جاگیرا کا چہرہ بھی نظر کے آگے دوڑ جاتا۔انور اور قریشہ بھی۔

نواب الطاف حسین بھی.....

اور پھر وہ ایک ایک کر کے بوجھل منظروں کی قید میں ہوتی.....وہ سر جھکائے کھڑی ہے اور نواب صاحب اپنی خاندانی شمشیر کی دھار پرکھ رہے ہیں۔

●●

ساپتا ہک جن مانس.....اس کے قلم کی دھار تیز تھی۔اسے لگا تھا، بیتی باتیں اس نے وقت کے کوڑے دان میں پھینک دی ہیں ـــــــ اور اب وہ نئے سرے سے اپنی پہچان بنانے میں جٹی ہے۔

●●

اس دن فرقہ واریت کے خلاف منڈی ہاؤس میں ایک گوشٹھی ہوئی تھی۔تب اس نے ونئے کو دیکھا تھا۔چپ چاپ خاموش رہنے والے ونئے کو.....ونئے جی بھر کر بولا تھا.....اس کے لفظ، لفظ نہیں تھے آگ کے گولے تھے ـــــــ

اس نے ذرا دیر کو سوچا تھا..... یہ ونئے جیسے لوگ مٹھی بھر کیوں ہیں؟

تب شعیب بھی اس کے ساتھ تھا.....وہ ونئے کے ساتھ رہ رہا تھا۔

شعیب نے دبی زبان میں اس سے کہا تھا۔''اب یہ اکیلا پن کاٹ کھانے کو دوڑتا ہے۔''

اس کی آنکھوں میں سہمے سہمے سے کچھ سوال تھے۔ وہ ان سوالوں کو اب دھیرے دھیرے ـــــــ اپنے وجود سے کاٹنے لگی تھی۔لیکن یکا یک جلد بازی میں کوئی بھی فیصلہ کرنے کے حق میں نہیں تھی.....اس لئے کہ یہ ساری زندگی کا سوال تھا۔

انور اور قریشہ کے خط بہت دنوں تک آتے رہے۔اب سال بھر ہونے کو آیا تھا ـــــــ اس درمیان ادھر سے چپی چھا گئی تھی۔کبھی کبھی انجو کا ننھا سا دل کانپ جاتا۔ جانے کیا بات ہے.....لیکن اس نے خط لکھنے کا سلسلہ ختم نہیں کیا.....وہ دلوں کے ان معصوم رشتوں کو توڑنا نہیں چاہتی تھی۔

●●

اس دن.....جن مانس کے لئے وہ غریبوں کی ایک بستی کا دورہ کرنے گئی تھی.....اسے ایک رپورٹ تیار کر کے دینی تھی۔راجدھانی کی وہ بستیاں جو سرکاری امداد سے آزاد تھیں اور جہاں جھگی والوں کو پانی، پاخانے سے لے کر کئی کئی مصیبتوں کا سامنا کرنا پڑتا تھا۔

اس بھینس ٹولہ سے لے کر اس فلیٹ تک کا سفر کچھ زیادہ بہتر نہیں کہا جا سکتا۔وہاں بدبو تھی ـــــــ کم پڑھے لکھے مسلمانوں کی جاہلانہ باتیں تھیں ـــــــ تو یہاں کا پورا علاقہ بی جے پی والوں کے اثر میں تھا۔گھروں پر بھگوا جھنڈے لگے تھے ـــــــ دیواروں پر خونی نعرے لکھے تھے ـــــــ کبھی کبھی آتے یا جاتے وہ ان نعروں کی زد میں بھی آ جاتی.....اور ایسے میں تنہائی کا جان لیوا احساس، اس کے وجود پر چھا جاتا.....

لمحہ لمحہ ایک بکھراؤ ہی تو ہے تمہارے پاس ـــــــ

●●

واپسی میں ان کا من کھٹا تھا.....گھر واپس آئی تو قریشہ کا ایٹم بم، اس کا انتظار کر رہا تھا۔

قریشہ کے خط کو ہاتھوں میں لے کر وہ بہت دیر تک پڑھنے کی ہمت نہیں پیدا کر سکی۔ خطرے کا الارم مستقل بج رہ تھا.....کانپتے ہاتھوں سے اس نے خط چاک کیا۔ایک ننگی سچائی اس کی روح کو ریزہ ریزہ کرتی چلی گئی.....لکھا تھا۔

●●

''افروز

تم پوچھتی ہو خط کیوں نہیں لکھتی؟ جب اپنا آپ خود ہی لہولہان، ہو تو تمہیں لہولہان کرنے سے فائدہ؟ گھر کی حقیقت تو تمہارے سامنے ہی کھل گئی تھی.....تمہارے جانے کے بعد ہماری گھریلو الجھنوں میں لگاتار اضافہ ہوتا رہا۔ایک ایک کر کے گولہ کے باقی لوگوں نے بھی کرایہ دینا بند کر دیا۔نواب صاحب کی نوابیت کی لاش تیار تھی۔حویلی نیلام ہونے کی نوبت آ گئی تھی۔ قرض خواہوں کے قرض چڑھتے جا رہے تھے۔بنیوں نے شور مچانا شروع کر دیا تھا۔بھائی جان نے تھوڑے بہت ٹیوشن بھی کئے ـــــــ لیکن بھلا اس سے کیا ہونے والا تھا۔اب ایک ہی راستہ تھا۔ حویلی بیچ دی جائے.....حویلی کی بولی لگ چکی تھی.....

تم نے نواب صاحب کے کمرے میں ایک خاندانی زنگ آلود شمشیر دیکھی ہوگی.....

ایک صبح ابا اپنے کمرے میں مردہ پائے گئے ـــــ وہ خاندانی شمشیران کے پیٹ کو چیرتی چلی گئی تھی.....مرتے وقت بھی چہرہ پر الجھن کے آثار تھے ـــــ جیسے یہ بزدلانہ فیصلہ کرتے وقت بھی ذہنی کشمکش چل رہی ہو.....

اب لگتا ہے، یہ گھر بچانا تھا تو ابا کو یہ فیصلہ پہلے کرنا چاہئے تھا..... یوں بھی گھر میں ان کی موجودگی اور ناموجودگی دونوں برابر تھی۔ تم یقین کروگی، ابا کی موت پر صرف بھیا روئے۔ میں نے ایک آنسو نہیں بہایا.....امی جان صرف چپ رہتی ہیں۔ کچھ بولتی نہیں.....

حویلی بک چکی ہے۔ ہم ایک چھوٹے سے گھر میں کرائے پر رہ رہے ہیں۔ بھیا انجینئرنگ مکمل نہیں کر پائے۔ اب ایک جگہ کلرکی کر رہے ہیں۔ رہ گئی میں۔ تو میری کوئی منزل نہیں۔ میں نے پڑھائی کب کی چھوڑ دی۔

تمہیں اور بوجھل نہیں کرنا چاہتی۔ امی کو میری شادی کی فکر ہے۔ دو، رشتے پہلے ہی کٹ چکے ہیں۔ میرے لئے کوئی تیسرا رشتہ بھی آئے گا۔ یہ خواب خیال کی باتیں ہیں..... میں نے بھی امید اٹھا دی ہے۔

ہاں کبھی کبھی سوچتی ہوں۔ کیا ہمارا سچ یہی تھا؟

تو نواب صاحب نے اس سچ کو بہت پہلے قبول کیوں نہیں کیا؟ ایک بات اور سوچتی ہوں۔ میں نواب خاندان میں کیوں پیدا ہوئی؟ سوچنے لائق بہت سی باتیں ہیں لیکن سوچنے سے تکلیف ہوتی ہے۔ تمہیں زیادہ بوجھل نہیں کرنا چاہتی۔ اس لئے خط بند کرتی ہوں۔

تمہاری قریشہ۔''

(7)

یہ کہانی تو کب کی ختم ہو چکی ہوتی۔ اگر اتفاق سے اس دن اس نے وہ منظر نہ دیکھ لیا ہوتا.....نہ دیکھ لیا ہوتا اور خاموشی سے آگے بڑھ گئی ہوتی۔

جن مانس کے لئے رپورٹ تیار کرنے نکلی تھی وہ.....

تیز دھوپ چاروں طرف پھیلی تھی۔ بدن جل رہا تھا۔ وہ بھی پسینہ میں نہائی ہوئی تھی۔

اچانک ٹھہر گئی۔ وہاں دور تک منتریوں کے سفید کوارٹر بنے ہوئے تھے۔ اتفاق سے اس کی نظر ایک طرف چلی گئی۔ کئی آدمیوں سے گھرا ہوا تھا ایک شخص، کھادی کے کپڑے پہنے اپنی چمچماتی گاڑی کی طرف بڑھ رہا تھا۔

پھر وہ شخص گاڑی بھی بیٹھ گیا۔ ڈرائیور نے گاڑی اسٹارٹ کی۔

انجو ٹھگی سی دیکھتی رہ گئی.....

شخص ـــــ

یہ

اس کی آنکھیں دھوکا نہیں کھا سکتیں.....

پھر یہ سب کیا تھا.....

یہ آدمی کون تھا.....؟

ایک شخص نے پوچھنے پر بتایا.....منتری ہیں..... جاگیرا صاحب ابھی ابھی راجیہ سبھا کے ممبر نامزد ہوئے ہیں۔

''منتری راجیہ سبھا کے.....''

اندر ہلچل سی مچ گئی.....لگا، اس کی شناخت ادھوری ہے۔ امتحان کا وقت تو اب آیا ہے۔

''جاگیرا صاحب.....'' ایک زہریلی ہنسی اس کے ہونٹوں پر نمودار ہوئی۔

بائی اماں کے آگے دس دس روپیوں کے بنڈل کو پھینکتا ہوا جاگیرا..... گوہر جان، یہ تیرے افروز کی نتھ اترائی کی قیمت ہے.....

ٹوٹی کواڑ اور دہشت زدہ سی اماں کے آگے جلتی مشعل لئے کھڑا جاگیرا.....

دھند میں ڈوبی ساری تصویریں یکا یک اس کے ذہن میں زندہ ہوگئیں۔

●●

ونئے اور شعیب نے بھی سنا تو دنگ رہ گئے۔

''تم نہیں جانتی، حیرت ہے۔ پچھلے تین برسوں سے جاگیرا صاحب ایکٹیو پالیٹکس میں ہیں۔''

شعیب نے کہا..... ''کوئی الزام لگانے سے پہلے سوچ لو کہ کیا کرنے جارہی ہو۔ مصیبت میں پھنس جاؤ گی۔

ونئے نے کہا..... ''جاگیرا صاحب اور ویشیاؤں کے دلال..... یقین نہیں آتا..... لیکن تم کیسے جانتی ہو اور کیا ثبوت ہے تمہارے پاس؟''

''ثبوت؟''

جیسے وہ کسی گہری سوچ میں ڈوب گئی ـــــــ وہ انجو ہے یا افروز؟

وہ بائی اماں کی ناجائز پیداوار ہے.....

شہر بدلنے سے چہرہ تو نہیں بدل جاتا.....

خاندان تو نہیں چھپ جاتا.....

اسے لگا، وہ سچ بولے گی اور بے آبرو ہو جائے گی.....

اسے لگا وہ مسلسل جھوٹ بولتی رہی ہے۔ فلیٹ کرائے پر حاصل کرنے کے لئے جھوٹ، ایک بار انجو بن جانے کے بعد وہ انجانے میں لگاتار جھوٹ سے ہی کھیل رہی ہے۔

افروز صرف اس کی روح میں بستی ہے.....

یا پھر گھر کی تنہائی میں.....

اسے لگا، وہ سچ اگلے گی اور ایک ساتھ سب کی آنکھیں اس کی آنکھوں میں داخل ہو جائیں گی تو.....

تم..... انجو تم..... یہ سب کیا ہے؟

پھر دھماکہ ہوگا.....

جن مانس کے ایڈیٹر پوچھیں گے۔

روی پوچھے گا..... بنسل اور سیما پوچھتا چھ کریں گے۔

سنگھل اور ٹنڈن حیرت زدہ رہ جائیں گے۔

اور وہ..... جہاں رہتی ہے..... بھگوا جھنڈا لگانے والے گھروں کے لوگ؟

اچانک سب کی آنکھوں میں تیز نفرت سما جائے گی.....

●●

وہ ڈرتے ڈرتے سمپادک جسویر تھانی کے کمرے میں داخل ہوئی اور سچ اگل دیا۔ تھانی صاحب کو جیسے کسی بچھو نے ڈنک مارا.....

''بڑے آدمی ہیں جاگیرا صاحب۔''

''میں ان کے خلاف جن مت جٹاؤں گی۔''

وہ کمرے سے باہر نکلی تو ایک نئے سچ کا انکشاف ہو چکا تھا۔

اس ماحول میں..... ہاں اس ماحول میں بھی سچ بول سکتی ہے وہ..... یہ راجیہ سبھا کی عزت کا سوال تھا۔ وہ اس عہدہ پر جاگیرا جیسے لوگوں کو ہرگز قبول کرنے کے حق میں نہیں تھی۔

اس نے واپس اپنے وطن جانے کا فیصلہ کرلیا۔ اب ایک ہی سوال تھا۔ کیا وہ جاگیرا کے خلاف جن مت جٹا پائے گی؟

●●

جانے سے پہلے ایک حادثہ ہوگیا۔

تاریخ کے ناپاک صفحوں سے فرقہ واریت کا لفظ اُچھلا اور اڈوانی جی کے رتھ میں سما گیا..... کوئی ضروری نہیں کہ ہر واقعہ کی تفصیل بتائی جائے۔ اتنا کہنا کافی ہے کہ ملک جل رہا تھا۔ سونے پر سہاگہ شری اڈوانی جی کا رتھ ہوگیا۔ جو پورے ملک میں فساد کراتا ـــــــ معصوم انسانوں کی فصل کو روندتا ہوا تیز رفتاری سے دوڑ رہا تھا۔ خاص بات صرف اس قدر تھی کہ اس آندھی میں گونڈہ ضلع کا ایک شخص بھی کام آگیا ـــــــ

یہ آدمی شعیب کے روم پارٹنر ونئے کا بڑا بھائی تھا۔

(8)

ایک انجان سا نظر آنے والا شہر..... چپے چپے پر جیسے یادیں بکھری پڑی تھیں۔ لیکن انجو ان یادوں کو کھرچنے میں مشغول تھی۔ ایسے کہ یہ شہر پہچانا ہی نہیں جا سکے۔

لیکن زخم کہاں چھپتے ہیں.....

وہ جس کام کے لئے نکلی تھی، اس کام میں تو بار بار زخم کے رسنے کا ڈر تھا۔ پورا شہر ہی اچانک اسے ڈسنے پر اتر آیا تھا۔

کل اور آج میں کتنا فرق تھا۔

وہ پھر انہی وادیوں میں تھی، جہاں سے مجرے کی آواز گونجا کرتی تھی۔ اجمیری بائی کا کوٹھا ـــــ دلشاد جان، نسیم بانو، مہر بائی، قمرو، رخسانہ..... اور بھی کتنی ہی طوائفیں.....

●●

''نکو..... نا بابا، نا.....'' رخسانہ تو صاف ہی مکر گئی۔

اجمیری بائی نے ٹھنڈی سانس بھری.....

''جو اس جہنم سے نکل گیا وہ بھلا..... تم گوہر جان کی امانت ہو..... جاگیرا سے دشمنی کیوں مول لے رہی ہو۔ جو کر رہی ہو وہی ٹھیک ہے۔''

دلشاد جان ناگواری سے بولی..... ''جاگیرا نے تو جو بھی کمایا، موے نے دنگوں میں کمایا..... بے رحم..... لاج بھی نہیں آئی کم بخت کو..... بھڑوے کا بچہ، سالا آج نیتا بنتا ہے۔ ساری کمائی تو لوٹ کی تھی۔ بس لوٹ کی۔''

انجو دھیرے سے بولی..... ''بس یہی تو چاہتی ہوں میں۔ اس کاغذ پر اپنے دستخط کر دو۔''

''نا بابا، نا۔''

دلشاد جان پیچھے ہٹ گئیں۔ جیسے ڈھیر سا دے بچھو کو دیکھ لیا ہو۔

''آپ لوگ تو گواہ ہیں۔ جب رانی منڈی اور پاس کے علاقہ میں فساد چھڑا تھا، لچوں لفنگوں کے ساتھ یہی جاگیرا تھا جو گوہر بائی کے مکان میں بھی آگ لگانے آیا تھا۔

اجمیری بائی نے غصّے سے انجو کو دیکھا۔ ''افروز جان ہمارے پیشہ کو تو بخش دو..... تم نہیں جانتی جاگیرا کی طاقت۔''

''آپ چپ رہیں تو یہ طاقت بڑھتی چلی جائے گی۔''

''ہمارے سنے گا بھی کون۔ اتنا بڑا شہر ہے۔ دوسروں کے پاس کیوں نہیں جاتی تم؟''

''دوسرے کے پاس بھی جاؤں گی..... لیکن یہ بات صرف رانی منڈی کے لوگ ہی جانتے ہیں کہ جاگیرا کی اصلیت کیا ہے۔''

''وہ اب نیتا بن گیا ہے۔ ہم مجبور ہیں۔ مہر بائی ہوائی چپل پیر میں ڈالتے ہوئے بولی۔'' میں تو چلی..... اس پچرے میں کون پڑے۔''

اجمیری بائی نے کہا..... ''ہم تو پہلے ہی لٹے لٹائے ہیں افروز جان..... پیشہ سے بھی جاتے رہے تو سڑکوں پر بھیک مانگنے کی نوبت آ جائے گی۔''

''یہ جگہ تمہارے لائق نہیں رہی افروز جان۔''

دلشاد جان کا لہجہ کچھ کمزور پڑ گیا۔ ''تم جا سکتی ہو۔''

وہ کوٹھے سے نیچے اتر آئی.....

●●

پنواڑی، ادھر ادھر گھومتے بھڑوے ـــــ کوٹھے کے نیچے بیٹھے فقیر ـــــ جیسے سب اسے پہچاننے کی کوشش کر رہے تھے۔

اس کے قدم بوجھل تھے۔

یا شاید وہ سچ مچ ہار گئی تھی۔

ایک گھر۔

دو گھر.....

تین..... پانچ.....سات.....

پھر اس نے کتنے ہی دروازے کھٹکھٹائے..... کتنے ہی لوگوں سے ملی.....لوگ اس کے خلاف بولنے کی ہمت نہیں رکھتے تھے۔ جاگیرا کیسے بنا، اس مقام تک کیسے پہنچا، یہ کہانی سب کو معلوم تھی۔ مگر اتنے بڑے شہر میں کوئی اس کے خلاف اٹھنے کو تیار نہیں تھا.....

یہ گھر اس کی آخری امید کا مرکز تھی..... وہ تھکی ہاری مایوسی سے اتری تھی..... کہ اچانک بیس بائیس سال کی ایک لڑکی دوڑی دوڑی اس کے پاس آ کر ٹھہر گئی۔

سنئے!

وہ ہانپ رہی تھی.....

انجو نے ٹھٹھک کر دیکھا..... وہ میلی ساڑی میں تھی مگر اس کے باوجود چہرے مہرے سے طوائف نہیں لگ رہی تھی۔

''میرے پاس وقت کم ہے۔ اس وقت میں دلشاد بائی کے یہاں تھی۔ آپ کی باتیں سنیں۔ جاگیرا مجھے یوپی کے گاؤں سے بھگا کر لایا تھا..... مجھ سے شادی کا ناٹک کھیلا اور یہاں کوٹھے پر ڈال گیا۔''

اس نے بلاؤز میں ہاتھ ڈالا اور ایک میلی سی تصویر نکالی ـــــــ ''یہ رکھ لیجئے.....لائیے میں دستخط کر دیتی ہوں۔''

وہ کافی گھبرائی سی لگ رہی تھی۔

انجو نے کاغذ آگے کیا۔ لڑکی نے کانپتے ہاتھوں سے دستخط کر دیا۔

''اچھا میں چلتی ہوں۔''

''سنو.....تم کہیں کسی مصیبت میں پڑ گئی تو.....؟''

وہ ٹھٹھکی .....انجو نے اس کی آنکھوں میں آنسوؤں کے ڈورے تیرتے ہوئے پائے۔

''اب اس سے زیادہ اور مصیبت کیا ہو سکتی ہے۔''

پھر اس کے بعد وہ ٹھہری نہیں..... بھاگتی ہوئی چلی گئی.....لیکن کیا صرف ایک دستخط کافی تھا۔ اس نے اس دھندلی میلی تصویر کو غور سے دیکھا۔ جاگیرا اس عورت کے ساتھ اگنی کے

پھیرے لے رہا تھا۔

●●

تھانی جی نے تصویر کو غور سے دیکھا۔ پھر بولے.....

''انجو! یہ کافی نہیں ہے ـــــــ تم جن مت کہاں جٹا پائیں؟''

''لیکن سر؟''

انجو کی آواز لرز رہی تھی.....ایسے لوگوں کے خلاف لکھنا بہت ضروری ہے سر۔ ان لوگوں نے راجیہ سبھا اور ملک دونوں کا ہی اپمان کیا ہے۔ جاگیرا کل تک ایک معمولی سا دلال تھا۔ طوائفیں اس بات کی گواہ ہیں کہ دنگوں میں اُس نے کافی مال کمایا اور مال ہی نہیں کمایا بلکہ سیاست کے اکھاڑے میں بھی کود پڑا.....اور دیکھتے ہی دیکھتے دو برسوں کی سیاسی اٹھا پٹک کے بعد وہ کہاں سے کہاں پہنچ گیا.....

تھانی جی نے اسے غور سے دیکھا..... ''مجھ میں اپنا اخبار بند کرانے کی ہمت نہیں ہے۔''

●●

ساری رات وہ بچھوؤں کے بستر پر کروٹیں بدلتی رہی۔

اس کے اندر جیسے زبردست آگ دھدک رہی تھی۔

ہاں اس نے کڑوے سچ کا انکشاف کیا تھا، کڑوے سچ کا ـــــــ

پتہ نہیں، رات کے کتنے پہر گزر گئے۔ گزری یادوں نے اسے لہولہان کرنا شروع کر دیا۔

وہ لکھتی گئی، لکھتی گئی.....اسے محسوس ہوا، بدی ماما کی روح کو ایک سکون سا ملا ہو..... اسے لگا، کسی گوشہ سے اچانک بائی اماں نکل کر اس کے سامنے کھڑی ہو گئی ہوں۔

''ہمارا کیا ہے، لیکن تو اس ماحول سے نکل جا۔ ہمیشہ سچ بولنا افروز.....''

اس کی آنکھیں گیلی ہوتی چلی گئیں۔

(9)

دوپہر میں وہ دفتر میں ہی تھی کہ شعیب کا فون آیا۔ شعیب کی آواز کانپ رہی تھی.....
شام میں ملو.....'

''لیکن میں آج.....''

''تم سے ملنا بہت ضروری ہے۔''

''کوئی خاص بات ہے کیا؟''

''ہاں'' کچھ ایسا ہی سمجھو۔

ادھر وہ چند دنوں سے شعیب سے نہیں مل سکی تھی۔ ادھر کچھ بھی اچھا نہیں لگ رہا تھا۔ روز روز کی خبروں سے الجھن ہوتی تھی.....

_____ اتنے مسلمان مارے گئے.....

_____ اتنے ہندو.....

دنگوں کی خبروں کو اس نے پڑھنا ہی بند کر دیا تھا..... یہ ساری خبریں جیسے باسی ہوگئی تھیں..... یہ ملک کہاں جا رہا ہے.....لوگوں کو یہ کیا ہوتا جا رہا ہے.....

اسے لگا، سیاست نے ذہنوں کی جیسی تقسیم اب کی ہے، پہلے کبھی نہیں کی.....اب وہ دوستوں سے ملتی، تو ان کے چہروں پر بھی فرقہ وارانہ رنگ دیکھتی..... ہاں، اس دن وہ ونئے کی بات پر چونکی تھی.....

''مسلمان زیادہ کمیونل ہیں۔ ان کے مذہب میں.....''

کتنا مذہب جانتے ہو تم''.....وہ چیخی تھی۔

''چیخو مت''

ونئے کی آواز میں کڑواہٹ تھی.....''وہ ہمارا دوغلہ پن ہے جو چائے کی ان میزوں پر سمٹ آتا ہے.....اس سے الگ، گھر کی میزوں پر ہم کیا ہیں؟ ہم ہندو ہیں افروز یا شعیب مسلمان ہیں.....تمہارے مذہب میں کافروں کو جان سے مارنا بھی گناہ نہیں۔''

''تھوڑا بہت مذہب تو میں بھی جانتی ہوں ونئے۔ اسلام میں چھوٹے سے چھوٹے 'ذی روح' کو تکلیف پہچانے سے منع کیا گیا ہے۔''

''اسی لئے قربانی تمہارے یہاں جائز قرار دی گئی ہے۔ تمہارے مذہب کی پیاس جانوروں کو مار کر بجھتی ہے.....''

''ونئے.....!''

وہ حیران اسے دیکھ رہی تھی۔

ونئے یہ کیا کہہ رہا ہے، کیا بول رہا ہے، وہ جس پتہ پر فخر کر سکتی تھی، وہ پتہ بھی ڈال چھوڑ رہا ہے.....اسے ونئے پر بھروسہ تھا۔ ونئے جیسوں پر..... کہ جب تک اس جیسے لوگ باقی ہیں یہ ملک باقی ہے اور 'ذہنیت' کو کبھی بھی صحیح سوچ کے دائرے میں قید کیا جا سکتا ہے۔

اس نے سنا تھا، ونئے کا بھائی گونڈہ کے فساد میں مارا گیا۔ ونئے یہ خبر سن کر گھر بھی گیا.....اس نے اپنے بھائی کی لاش دیکھی ہے.....لیکن وہاں.....فساد میں اکیلے ونئے کا بھائی ہی تو نہیں مارا گیا..... ہندو بھی شہید ہوئے، مسلمان بھی.....

پھر اچانک اس کی سوچ اتنی زنگ آلودہ کیسے ہوگئی.....

نہیں.....سچ تو یہ ہے کہ وہ اس سلسلے میں کچھ سوچنا ہی نہیں چاہ رہی تھی.....

●●

اس حادثے کے ٹھیک دور سے دن ونئے نے اس کے دفتر فون کر کے اس سے معافی مانگی تھی.....مگر اس سے کیا ہوتا ہے.....

دلوں میں غبار جیسی کوئی چیز جم جائے تو.....؟

●●

شام میں وہ شعیب سے ملی تو وہ کافی گھبرایا ہوا لگ رہا تھا۔ داڑھی بڑھی ہوئی تھی،

چہرے پر الجھن کے آثار تھے.....

''کیا بات ہے؟''

''آؤ، وہاں بیٹھتے ہیں.....''

شعیب نے خالی میدان کی طرف اشارہ کیا اور وہاں کی ہری ہری گھاس پر دونوں بیٹھ گئے۔ اس نے ایک ٹھنڈی سانس چھوڑی۔

''سمجھ میں نہیں آتا کیا کہوں، کیسے کہوں۔''

''ماجرا کیا ہے؟''

''مجھے لگتا ہے وہ مجھے مار ڈالے گا۔'' اس کی آواز میں خوف اتر آیا تھا۔

''کون.....؟''

انجو کا دل دھک دھک کرنے لگا۔

''ونئے''

یہ اس سے بھی بڑا دھماکہ تھا——

''ونئے؟'' انجو تعجب میں چیخی..... ''ہوش میں تو ہو تم! تم دونوں اتنے اچھے دوست ہو۔ ایک ساتھ رہتے ہو.....''

''یہی تو عجیب بات ہے۔ اس نے مجھ سے معافی بھی مانگ لی.....لیکن ہم دونوں، کہنا چاہئے ایک دوسرے سے خوفزدہ ہیں، کیا جانے کب کون کسی پر حملہ کر دے.....''

''یہ کیا بک رہے ہو.....''

''اس دن وہ اپنے بھائی کی لاش دیکھ کر آیا تھا۔ کافی غصّہ میں بھرا۔ میں چپ رہا، جانتا تھا اس کا بھائی فساد میں مرا ہے، زخم تازہ ہے..... وہ جو بھی بولتا ہے، بولنے دو.....اس لئے کہ میرا بھائی بھی مرتا تو میں بھی دو لفظ ہندوؤں کے خلاف ضرور بولتا—— نہ بولتا تب بھی دل میں یہ بات رہتی کہ میرے بھائی کو ہندوؤں نے مارا ہے..... یہ زہر پینا تھوڑا مشکل ہوتا میرے لئے بھی.....اتنی نفسیات تو میں بھی جانتا ہوں مگر کیا معلوم کہ اچانک.....''

شعیب کی آنکھیں خوفزادہ تھیں.....

''اس رات کو اچانک میری نیند کھل گئی۔ کہنا چاہئے میری چھٹی جس نے مجھے جگا دیا۔ کیا دیکھتا ہوں، ونئے سبزی کاٹنے والا ہنسوا لے کر مجھ پر حملہ کرنے والا ہے.....میرے منہ سے

ایک بھیانک چیخ نکل گئی..... میں نے اسے دھکا دیا۔ لڑکھڑاہٹ میں ونئے گرا۔ ہنسوا اس کے ہاتھ سے چھوٹ گیا..... میں نے پوری طاقت سے اسے جھنجھوڑا..... ونئے تم.....؟ تم مجھے مارنا چاہتے تھے.....؟ اچانک وہ پھوٹ پھوٹ کر رونے لگا.....شعیب مجھے معاف کر دو۔ میں نے بھائی کی لاش اتنی بری حالت میں دیکھی ہے کہ اچھے بھلے کی تمیز بھول بیٹھا.....اس و.....وقت مجھے صرف اتنا لگا کہ تم ایک مسلمان ہو اور تم ان لوگوں میں سے ایک ہو جس نے گونڈہ میں میرے بھائی کی ہتیا کی ہے.....تم ہی میرے بھائی کے قاتل ہو.....تمہیں مار ڈالنا چاہئے.....اور''

شعیب کی آواز لڑکھڑانے لگی تھی۔ ''عجیب بات یہ ہے کہ ہم دونوں ساتھ ہی رہنا چاہتے ہیں۔ ہم دونوں میں سے کوئی کمرہ چھوڑنے کو تیار نہیں۔ ہم دونوں ایک آسمان اور ایک چھت کے نیچے ہی رہنا چاہتے ہیں—— اس رات ونئے نے رو رو کر مجھ سے معافی مانگ لی.....لیکن اس رات بھی خوف کے مارے ہم دونوں میں کوئی سو نہ سکا..... پتہ نہیں کب، کس کی آنکھ لگ جائے اور دوسرا ہنسوا چلا دے—— اسی کشمکش میں اس رات ہم دونوں میں کوئی سو نہ سکا.....آج چار دن ہو گئے ہیں افروز۔ ہم دونوں باتیں کر لیتے ہیں مگر ایک دوسرے سے ڈرے ڈرے رہتے ہیں اور کہنا چاہئے ساری ساری رات ہم دونوں میں سے کوئی نہیں سو پاتا.....''

وہ چپ ہو گیا۔

انجو نے اس کی آنکھیں دیکھیں.....آنکھیں سوجی ہوئی تھیں.....جیسے کئی رات کا جاگا ہوا ہو.....

''بتاؤ میں کیا کروں.....؟''

انجو کو لگا، وہ کہے.....اب..... پانی تو کم بختوں نے سر سے اونچا کر دیا ہے شعیب۔ تم یا ونئے کر ہی کیا سکتے ہو۔ ساتھ ساتھ رہنا بھی چاہتے ہو اور ایک دوسرے سے ڈرتے بھی ہو.....

اس نے کچھ نہیں کہا.....اس کا ذہن بوجھل سا ہو گیا تھا۔

اسے لگا، تقسیم کے اتنے برسوں بعد—— یہاں کے سیاستداں، دلوں کو بانٹنے میں کامیاب ہو گئے ہیں.....

(10)

آخر انجو کی محنت کام آئی۔ روزنامہ دیس نے اس کا مضمون چھاپنا منظور کرلیا۔ انجو جانتی تھی.....وہ شعلوں میں گھر چکی ہے.....

لیکن اسے شناخت چاہئے تھی.....

پہچان.....

بائی اماں کے گھنگھروؤں کو پیچھے چھوڑ دینے کی خواہش کا آخری پڑاؤ تو یہی پہچان ہے۔ وہ کچھ کرنا چاہتی تھی.....

اسے اپنی جان کا خوف نہیں تھا.....جن مانس کے ایڈیٹر تھانی نے اسے سمجھایا بھی تھا۔

''کوئی بھی بڑا اخبار یہ رسک لے سکتا ہے، اس لئے کہ یہ ایک چٹخارے دار خبر ہوگی.....''

''چٹخارے دار.....اس کی محنت اور جدوجہد کو تھانی صاحب صرف اتنا ہی سمجھ سکے تھے۔

●●

خبر چھپی.....اور سچ مچ ہنگاموں کا ایک طوفان سا آ گیا.....اسے کتنے لوگوں نے مبارک باد دیا۔ دوستوں نے سمجھایا.....تم اکیلی ہو۔ جاگیرا جیسے نیتا عہدہ بچانے کے لئے کچھ بھی کرسکتے ہیں۔ جاگیرا نے اپنے بچاؤ میں کہا تھا..... یہ ساری باتیں جھوٹ ہیں من گھڑنت ہیں ـــــ رانی منڈی اور وہاں کی طوائفوں سے اس کا کوئی رشتہ نہیں۔ وہ تو وہاں کبھی گیا ہی

نہیں ـــــ جو تصویر اس کے خلاف استعمال کی گئی ہے وہ بھی نقلی ہے۔ اس طرح کی جالی تصویریں کوئی چھوٹا موٹا فوٹوگرافر بھی تیار کرسکتا ہے۔ جاگیرا صاحب کا کہنا تھا کہ اس مضمون کے پیچھے کوئی اور چھپا ہے، جو ان سے کوئی پرانی دشمنی نکال رہا ہے.....وہ مسکراتے ہوئے بولے تھے.....

''بھلا میرا کون دشمن ہوسکتا ہے۔ میں تو عوام کا خادم ہوں۔''

دوسرے دن کے اخباروں نے اس سیکس اسکینڈل کو کافی اچھالا تھا.....خبر ملی تھی کہ جاگیرا صاحب اخبار اور رپورٹر دونوں پر ہتک عزت کا دعویٰ ٹھوکنے والے ہیں۔

●●

چاروں طرف سے حکومت کی توہین ہوئی تھی اور یہ طے تھا کہ جاگیرا صاحب کو راجیہ سبھا کی ممبری سے استعفیٰ دینا ہوگا۔

ادھر تھانی صاحب نے کسی باہری دباؤ کے آگے جھک کر انجو کو نوکری سے الگ کردیا تھا.....وجہ یہ بتائی گئی تھی کہ ایک اخبار کی نوکری کرتے ہوئے دوسرے کے لئے لکھنا اخبار نویسی کے اصولوں کے خلاف ہے۔

انجو خوف اور خطروں میں چاروں طرف سے گھر گئی تھی۔

مگر اسے اطمینان تھا.....وہ جیت گئی ہے.....

●●

اور اس کے ٹھیک پانچویں دن جاگیرا صاحب نے استعفیٰ دے دیا۔ جسے منظور کرلیا گیا۔ انہوں نے واضح کیا کہ یہ استعفیٰ انہوں نے راجیہ سبھا کی عزت بچانے کے لئے دیا ہے، وہ سب سے پہلے خود پر لگائے گئے الزامات مٹانے کی کوشش کریں گے۔

انجو کو پتہ تھا.....جاگیرا چپ نہیں بیٹھے گا.....وہ اس پر حملہ کرا سکتا ہے ـــــ قتل کی کوشش کرسکتا ہے۔ اکیلی لڑکی جان کر اسے اٹھوا بھی سکتا ہے۔

اب اسے شعیب کی ضرورت سختی سے محسوس ہو رہی تھی.....وہ ایک زندگی چاہتی تھی، گھر چاہتی تھی.....

کیا شعیب سب کچھ جانتے ہوئے اسے قبول کرلے گا؟

اسے.....؟

ایک بگڑے نواب کی ناجائز اولاد کو.....؟

●●

وہ دو دنوں سے اپنی سہیلی کے گھر تھی ـــــــ دو دنوں سے وہ دفتر بھی نہیں گئی۔ بیماری کا بہانہ کر دیا۔ یہ واضح کر دینا چاہئے کہ صحیح معنوں میں اسے ڈر لگنے لگا تھا..... وہ اچانک چونک اٹھتی تھی.....ایسا معلوم ہوتا تھا، جیسے پیچھے سے آ کر اچانک وہ ہاتھ اُسے دبوچ لیں گے اور.....

●●

یہ سیما تھی.....فری لانسر، اس وقت آٹھ بجے ہوں گے۔ شام کی چائے پی کر ڈرائنگ روم میں بیٹھی وہ دیس میں چھپی اپنی رپورٹ پڑھ رہی تھی۔

موصولہ ذرائع کا کہنا ہے کہ راجیہ سبھا کے نئے نامزد ممبر جناب جاگیرا کا سیدھا رشتہ رانی منڈی کی طوائفوں سے رہا ہے۔ جاگیرا اسی ماحول میں پلے بڑھے۔ میدان سیاست میں قدم رکھنے سے پہلے رانی منڈی میں ان کی حیثیت دلال (عام زبان میں جسے بھڑوا کہا جاتا ہے) جیسی تھی۔ وہ دلشاد جان، مہربائی، رخسانہ، کوثر جان اور دوسری ویشیاؤں کے لئے لڑکیاں سپلائی کرتے تھے اور سڑکوں سے بٹور کر گاہک ٹھیک کیا کرتے تھے۔

ہماری خبر رساں نے مذکورہ رانی منڈی کی ویشیاؤں سے بات چیت کی مگر وہ جاگیرا کے ڈر کی وجہ سے کچھ بھی بتانے سے انکار کرتی رہیں۔ دلشاد جان کی کچھ برس پہلے خریدی گئی، ایک زور زبردستی سے بنائی گئی ویشیا کا کہنا ہے کہ جاگیرا پہلے گاؤں میں آ کر اس کے یہاں ٹھہرا، ماں باپ کا دل جیت لیا۔ پھر شادی کے بعد، جو کہ صرف ایک ڈھونگ تھا، یہاں لا کر رانی منڈی میں ڈال دیا۔ اس جیسی رانی منڈی میں کئی لڑکیاں ہیں جنہیں جاگیرا نے یہ پیشہ کرنے پر مجبور کر دیا ہے۔

موصولہ ذرائع کے مطابق کچھ سال پہلے وہاں بھڑکنے والے دنگے میں بھی جاگیرا کا ہی ہاتھ تھا۔ وہاں منڈی کی ایک ویشیا گوہر بائی کے یہاں بھی اس کا آنا جانا تھا۔ جاگیرا کی بری نظر گوہر بائی کی جوان لڑکی پر تھی، جو کسی نواب کی ناجائز اولاد تھی۔ کسی بات کو لے کر جاگیرا اور گوہر بائی میں کہا سنی ہوگئی.....دنگے کا فائدہ اٹھاتے ہوئے جاگیرا نے گوہر بائی کے گھر میں آگ لگا دی اور گوہر بائی کو زندہ جلا دیا۔

خبر کے آخر میں لکھا گیا تھا.....ممکن ہے کہ جاگیرا صاحب کل کے ان حادثوں کو بھول چکے ہوں لیکن شہر کے لوگوں کو ان کی دہشت آج بھی یاد ہے..... خاص کر وہ ویشیائیں جن کی آنکھوں کے سامنے ہی وہ پلے بڑھے ہیں.....تعجب ہے کردار کے ایسے عظیم انسان کو سرکار نے راجیہ سبھا کا، رکن منتخب کیا ہے۔

اخبار بند کرتے ہوئے انجو نے سوچا.....ابھی معاملہ دبا نہیں ہے، اسے کئی باتوں کا جواب دہ ہونا ہے..... بہت سی باتیں اس میں ایسی ہیں جن کے لئے اس سے سوال کیا جا سکتا ہے کہ وہ کیسے جانتی ہے؟

یہی سوال سیما نے بھی اس سے کیا تھا.....

اور روزانہ دیس کے ایڈیٹر نے بھی.....

اس نے ٹکا سا جواب دیا تھا.....ابھی وقت نہیں آیا۔ وقت آنے پر وہ سب کچھ بتا دے گی۔ کچھ اخبار نویس رانی منڈی جا کر کچھ ویشیاؤں کا انٹرویو بھی کر آئے تھے..... جاگیرا صاحب کا رشتہ ویشیاؤں سے تھا۔ یہ بات واضح ہوگئی تھی۔ لیکن وہ کسی صورت میں ماننے کو تیار نہیں تھے۔

●●

ٹھیک ساتویں دن جاگیرا صاحب کی طرف سے جوابی کارروائی ہوئی۔ روزانہ دیس کے خلاف انہوں نے ہتک عزت کا مقدمہ ٹھوک دیا۔

اور اس سے پہلے صرف ایک حادثہ اور ہوا.....دلشاد بائی کے کوٹھے سے شمع نام کی ویشیا اچانک غائب ہوگئی۔ یہ وہی ویشیا تھی جس کے ساتھ جاگیرا کی پھیرے لیتے ہوئے تصویر اخبار میں شائع ہوئی تھی..... یہ اتفاق ہی تھا کہ شمع کو پوچھتا پاچھتا ایک اخبار نویس دلشاد بھائی کے کوٹھے پر پہنچ گیا۔ دلشاد بائی نے بتایا کہ وہ کل سے غائب ہے اور اس کی اطلاع انہوں نے قریب کے تھانے کو دے دی ہے۔

دیس کے ایڈیٹر نے انجو کو فوراً بلایا تھا.....

''اب.....؟''

انجو نے رضامندی میں سر ہلایا.....'میں تیار ہوں۔ گوہر بائی کی لڑکی کون تھی، اور یہ ساری باتیں مجھے کیسے معلوم ہیں۔ میں راز کے سارے ورق کھول دوں گی۔ لیکن آپ قانونی

کارروائی شروع ہونے تک تھوڑا انتظار اور کرلیں۔

انہوں نے یہ بتایا کہ قانونی پیچیدگیوں سے نکلنے کے لئے روزنامہ 'دیس' کے مالک جناب گوئل جی نے بھی اسے یاد کیا ہے۔

●●

جس وقت وہ گوئل صاحب کے خوبصورت کیبن میں پہنچی، وہ اپنے قانونی مشیروں کے ساتھ صلاح کر رہے تھے۔

انجو کو دیکھ کر بات چیت کا رخ ہی بدل گیا۔

مشیر نمبر-1: تم نے جو بھی لکھا، کیا وہ ثبوت کے مطابق تھا یا صرف بات چیت کا نتیجہ؟

مشیر نمبر-2: وہ واحد عورت تم نے جس کا فوٹو اور بیان چھاپا ہے، وہ بھی غائب ہے، کئی باتیں ممکن ہیں..... وہ ماردی گئی ہو..... جاگیرا جیسوں کے لئے یہ کوئی بڑی بات نہیں..... پیٹ میں کوئی وزنی پتھر باندھ کر اس کی لاش کسی بھی ندی نالے کی تلہٹی میں گرائی جاسکتی ہے۔ جہاں سالوں سال اس کا پتہ نہیں لگے گا۔ یہ بھی ممکن ہے کہ یہ جاگیرا کی کوئی چال ہو۔ وہ عین وقت پر شمع کو عدالت میں حاضر کردے اور شمع کوئی جھوٹا بیان دے دے۔

گوئل: تمہیں سچی بات بتانی ہی پڑے گی۔ یہ میرا ہی مشورہ تھا کہ تمہارا نام بیچ میں نہیں آنا چاہئے۔ لیکن تم نے جس طرح سے لکھا ہے، اس سے لگتا ہے کہ تم سارے واقعات کو بہت قریب سے جانتی ہو۔

انجو نے سر جھکا لیا، وہ بہت دھیرے سے بولی، اس لئے کہ میں اسی ماحول میں پلی ہوں۔ میں گوہر بائی کی لڑکی ہوں۔

پھر ایک ساتھ کمرے میں کئی دھماکے ہوتے چلے گئے ـــــــ

(12)

سچ؟

کیا اسے سچ سب کے سامنے ظاہر کردینا چاہئے؟

یہاں آکر اس نے بدن سے..... وہ گندی اور بدبودیتی ہوئی کینچلی اتار دی تھی۔ جو اس ماحول میں اسے چبھتی رہتی تھی۔

ہاں، یہ خوف بھی تھا کہ وہ سچ بولے گی اور بے لباس ہوجائے گی۔

ٹھک..... ٹھک.....

دماغ میں شور برپا ہے۔ رات گہرا گئی ہے..... لیکن اس کی آنکھوں میں نیند نہیں..... وہ عجیب عجیب آوازوں کے جنگل میں ہے..... آوازوں کا چوطرفہ حملہ اسے پریشان کئے جارہا ہے.....

انجو..... تم نے اچھا نہیں کیا.....

تم نے اچھا نہیں کیا.....

اس نے دیکھا..... شعیب کا ڈرا، ڈرا چہرہ.....

اس نے پایا، ونئے کی بدلی بدلی آواز.....

اس نے محسوس کیا..... مذہب کے پاؤں دھیرے دھیرے جسم میں رینگ رہے ہیں.....

اسے لگا..... ویشیائیں تو یہ ہیں ـــــــ دوغلے، مکار، دھوکے باز ـــــــ

اسے لگا، وہ قدم قدم پر شک کے جنگل میں رہی ہے۔ لوگ اچانک جان جائیں گے

کہ وہ.....

وہ کون ہے.....؟

پھر سوالوں کی بوچھار ہوگی.....

تم، انجو تم.....؟

وہ سوالوں سے گھر گئی ہے_____

مسلمانوں نے اپنا الگ پاکستان لے لیا تو..... اب یہاں ان کی ضرورت ہی کیا ہے_____؟

مسلمان کبھی اس ملک کے لئے وفادار نہیں ہو سکتے.....؟

کرکٹ میں جب پاکستان جیتتا ہے تو.....انجو تم.....؟

تم رہتے ہو ہندوستان میں اور سوچتے پاکستان کے بارے میں ہو_____؟

سچ کہوں تو دوغلے ہو تم لوگ.....

تمہارے مذہب کی پیاس تو جانوروں کو مار کر بجھتی ہے.....

بس تیز دھماکے.....

لیکن نہیں_____

●●

دروازے پر سچ مچ دستک ہو رہی تھی.....اتنی رات گئے۔ چہرے پر خوف پیدا ہوا۔ اس بار دستک کے ساتھ لرزتی ہوئی آواز بھی گونجی تھی.....

''افروز.....دروازہ کھولو.....''

ش.....ع.....ب..... وہ ایک دم سے چونکی..... بھاگتی ہوئی جا کر اس نے دروازہ کھول دیا۔

دروازے پر پسینے سے شرابور شعیب کھڑا تھا.....اس کا پورا جسم لرز رہا تھا.....

''دروازہ بند کر لو۔''

''شعیب..... یہ سب.....اتنی رات گئے.....''

''میں..... میں نے ونئے کا قتل کر دیا۔''

اس کا چہرہ آنسوؤں سے تر تھا.....''ہاں میں نے ونئے کی ہتیا کر دی۔''

●●

گہرا سناٹا_____

کمرے میں گہرا سناٹا چھایا ہے.....

آواز میں اتنی لڑکھڑاہٹ ہے کہ ٹھیک سے بولا بھی نہیں جا رہا۔ چہرے سے لے کر پورا جسم کانپ رہا ہے۔

'ہاں' میں نے قتل کر دیا۔ نہ کرتا تو وہ میرا کر دیتا۔ روز کی الجھنوں سے بہتر تھا کہ اس مسئلے سے چھٹکارا پایا جائے.....ایک نہ ایک دن یہ ہونا ہی تھا.....ہم ایک چھت کے نیچے تھے۔ ایک زمین پر.....مگر ایک دوسرے سے خوفزدہ اور سہمے ہوئے۔

اس کے جملے اٹک رہے تھے۔ لفظ ٹوٹ رہے تھے.....

''مگر افروز! تم ہی بتاؤ۔ کیا سچ مچ میں ہی اس کا ذمہ دار ہوں۔ میں نے تو صرف اپنی جان بچائی ہے۔ روز روز کی ذہنی الجھنوں سے خود کو آزاد کیا ہے۔''

●●

انجو پرسکون تھی..... برف جیسی!

ہاں.....جیسے وہ کسی برف گھر میں ہو_____ پورا جسم پتھرایا اور ٹھنڈا تھا_____

اسے لگا وہ شعیب سے پیار کرتی ہے تو اسے کوئی راستہ تو تلاش کرنا ہوگا۔

اسے لگا..... اس میں شعیب کا قصور کتنا ہے..... اسے بچانے کی ذمہ داری اس کی ہے۔

اسے لگا.....قصور تو ونئے کا بھی نہیں۔ ونئے نے اپنے بھائی کی لاش دیکھی تھی، جسے مسلمانوں نے مارا تھا_____ ایسے موقع پر کوئی بھی جذباتی ہو سکتا تھا.....

اسے لگا.....فساد اچھے اچھے ذہن کو بھی بدل سکنے کی طاقت رکھتا ہے.....

●●

اسے لگا.....اسے نام سے پرکھا جا رہا ہو.....

تم انجو ہو یا.....افروز.....؟ کون ہو تم.....؟

ٹھک.....ٹھک.....ٹھک.....

نگاڑے بج رہے ہیں.....زور زور سے.....

لوگ اس سے پوچھ رہے ہوں.....

تم.....

تم انجو ہو یا.....؟

تم مسلمان ہو.....؟

اسے لگا مسلمان کے گھر پیدا ہو کر بہت بڑا جرم کیا ہے اس نے.....

●●

اسے لگا..... وہ عدالت تک کھینچ لائی گئی ہے۔ جاگیرا اچانک اسے دیکھ کر چونک گیا ہے ـــــ چونک ہی نہیں، بلکہ کانپ بھی گیا ہے.....اور اس کی آواز اپنی حدوں کے سارے باندھ توڑ کر بہہ گئے ہوں.....

تم پوچھتے ہو۔ میں کون ہوں..... میں مسلمان ہوں.....

ہاں..... میں مسلمان ہوں..... دہشت گرد، آتنک وادی..... میں مسلمان ہوں..... اور دیکھو ـــــ تم ڈر رہے ہو.....تم نے تقسیم کے بعد سے جینا دوبھر کر رکھا تھا ہمارا ـــــ تقسیم کے بعد سے ـــــ یاد کرو..... کتنے برس گزر گئے۔ ایک دو..... دس بیس..... چالیس..... کتنے برس گزر گئے..... پاکستان بننے میں جتنا ہاتھ جناح کا تھا اتنا ہی تمہارا..... جتنا مسلم لیگیوں کا تھا، اتنا ہی کانگریسیوں کا..... جتنا ہاتھ مسلمانوں کا تھا۔ اتنا ہی ہاتھ.....

لیکن ایک پاکستان بننے کا انتقام تم لگاتار قدم قدم پر ہم سے لیتے رہے۔ کبھی جنگ سنگھ اور آر ایس ایس بن کر، کبھی بابری مسجد کا تالہ کھولنے کے لئے کانگریس بن کر.....کبھی نصاب کی کتابوں میں جھوٹ بھر کر.....دراصل تم قدم قدم پر ہم سے بدلہ لے رہے تھے..... بدلہ.....

ہاں مسلمانوں ہوں میں.....اور تم آزادی کے بعد سے جمہوریت کی کھیتی کر رہے تھے اور کھیتی کے نام پر ہم ایک آسمان، ایک چھت کے نیچے رہ رہے تھے ـــــ ساتھ ساتھ.....محبت کی رسم نبھاتے ہوئے.....کیا ـــــ سچ کہو.....کیا ہم ڈر نہیں گئے تھے.....کیا ہم لگاتار دوست

ہونے کا ناٹک نہیں کر رہے تھے ـــــ ؟ اپنے اپنے گھر کے دروازے پر پہنچ کر تم ہندو اور ہم مسلمان ہو جاتے تھے..... ہاں، ہم یہ ناٹک کر رہے تھے.....ایک آسمان، ایک چھت کے نیچے رہنے کا.....پھر ان برسوں نے ہمیں اتنا ڈرا دیا.....اتنا ڈرا دیا..... کہ..... یہ تو ہونا ہی تھا.....یعنی برسوں سے دوغلہ بننے کی یہ کارروائی.....آنکھوں میں شک پالنے کی بربریت..... عدم تحفظ کا احساس.....

ہاں میں مسلمان ہوں.....مسلمان.....

جسے تم نے اچھوت اور طوائف بنا دیا ہے.....

لیکن.....میں کوئی طوائف نہیں ہوں.....

طوائف تو تم ہو.....

بازار میں جسم فروشی کرتی ویشیا اور تم میں کوئی فرق نہیں ہے.....تم اس سے زیادہ گندے ہو اور غلیظ.....

اسے لگا..... وہ بول نہیں پائے گی..... وہ رونا چاہتی ہے..... بوند بوند کر کے جسم میں جمع بارود، اب کسی جوالا مکھی کی طرح پھٹنے کو بے قرار ہے.....

اس نے دیکھا.....شعیب نگاہ نیچی کئے سسکیاں لے رہا تھا.....

یکبارگی وہ خوف سے نہا گئی.....

اسے ڈر لگ رہا تھا.....

اسے اپنے آپ سے ڈر لگ رہا تھا.....کوئی درمیان کی راہ تو نکلنی ہی چاہئے.....ورنہ ہر کوئی شعیب کی طرح.....

ایک چھت کے نیچے رہتے ہوئے بھی دونوں ایک دوسرے سے خوفزدہ رہیں گے.....

کیا پتہ کب کسی کو نیند لگ جائے اور دوسرا.....

●●

اچانک دروازہ کھول کر وہ باہر نکل گئی.....

خوفناک رات۔ باہر مسلسل کتّے بھونک رہے ہیں ـــــ

اسے خود پتہ نہیں تھا وہ کہاں جا رہی ہے.....

اندھیرے میں ہونے والی دستکیں بڑھتی جارہی تھیں ـــــ پہلے رانی منڈی۔ پھر دلّی ـــــ

اوراب یہ حادثہ ـــــ

اُسے ایک نئی جنگ شروع کرنی ہے ـــــ ایک نئے موسم کا گواہ بننا ہے.....

کسی نہ کسی کو آگے بڑھ کر ایک شروعات کرنی ہے۔ مگر ـــــ کہاں سے؟

●●

رات پُراسرار ہوگئی ہے۔ اندھیرا زمین پر 'بہہ' رہا ہے ـــــ خوفناک اندھیرے میں اُس کے قدم بج رہے ہیں ـــــ

وقت ایک نئی تاریخ لکھنے کی تیاری کر رہا ہے ـــــ

۳۷۸